

مہر

امجد جاوید

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

www.pakistanipoint.com

مہر و

امجد جاوید



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

www.pakistanipoint.com

سہارا

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ کمپوزنگ ٹیم



پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ جو لوگ وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈاؤنلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: صبا گل، تہلی، ٹیم لیڈر: ایم وائے صائم، مینجمنٹ: حبیب یار سے رابطہ کریں، شکریہ



”ڈاکٹر! آپ پلیز، اس کی مناسب دیکھ بھال کریں۔ میں کرتی ہوں اس کے لئے کچھ۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی ایک این جی او والی دوست مسز نورین کو فون ملایا۔

”ہائے فروا، کیسی ہو، بڑے دنوں بعد یاد کیا تم نے۔“ دوسری طرف سے چہک کر پوچھا کیا

تو وہ تمہیدی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی

”دیکھو، میں اس وقت ہسپتال میں ہوں، اور سمجھ لو ایک لاوارث مریض کی دیکھ بھال کرنی

ہے، ہر طرح سے، بولو کیا کہتی ہو؟“

”ارے، یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ میں ابھی بھیجتی ہوں دو بندوں کو۔“

”اسے خون کی بھی ضرورت ہے۔“ اس نے بتایا

”یار تم فکر نہ کرو، میں خود ان کے ساتھ آرہی ہوں۔ سب سنبھال لیتی ہوں۔“ اس نے

یقین دلایا تو بولی

”دیکھو نورین، مجھے ابھی یہاں سے نکلنا ہے، کیا میں تمہارا انتظار کروں؟“

”کہانا میں آرہی ہوں، تم چاہو تو میرا انتظار کر لو۔“ نورین نے تیزی سے کہا تو اس نے خدا

حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ پھر ڈاکٹر سے کہا،

”وہ میں نے کہہ دیا ہے، کیا میں اسے ایک نگاہ دیکھ سکتی ہوں؟“ اس نے انتہائی سنجیدگی سی

پوچھا

تھی، جس کے مینار دُور ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مزار کا گنبد تھا۔ دھیرے دھیرے وہ سب واضح ہوتا چلا گیا۔ لق و دق صحرا میں اس آستانے سے ذرا فاصلے پر بستی دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ دربار کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ دربار کافی اونچائی پر تھا، دس پندرہ سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔

وہاں دربار کے باہر ہی سیڑھیوں کے پاس کافی سارے لوگ جمع تھے۔ فرواُن سے اس دلہن کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی۔ تبھی چند لوگ تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا

”جی میرا نام ظفر ولد ار ہے، میں نے ہی چینل والوں کو اطلاع دی تھی۔“ فردا نے اسے دیکھا اور کار سے اتر آئی۔ یہ یقین کرنے کے بعد کہ یہ وہی لوگ تھے، جنہوں نے چینل والوں کو اطلاع دی تھی۔ اس نے کیمرے والے کو مخصوص اشارہ کیا اور ظفر سے پوچھا ”یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا وجہ ہے؟ وہ لڑکی کیوں بیٹھی ہوئی ہے دو دن سے؟“

”اس کا نام تو مہرین ہے، لیکن سب اسے مہروہی کہتے ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ وہ ایک لڑکے سے پیار کرتی ہے۔ اور مہرو کے ماں باپ نہیں چاہتے کہ اس لڑکے سے اس کی شادی ہو۔ خیر اس کی ضد کے سامنے ماں باپ ہار گئے یا انہوں نے مصلحت سے کام لیا، انہوں نے ہاں کر دی۔ لڑکے والے بارہا لے کر جا رہے تھے کہ ان کا حملہ ہو گیا اور حملہ آوروں نے صرف اسی

لڑکے کو اس قدر بے دردی سے مارا کہ اب وہ ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں پڑا ہے۔ شاید آپ اسے دیکھ کر آئی ہوں گی۔“

”ہاں میں نے دیکھا ہے، ابھی تک اسے ہوش نہیں آیا ہے۔“ فروانے بتایا تو بولا

”یہ واقعہ اسی جنڈ کے پاس ہوا ہے جہاں اب مہر و بیٹھی ہوئی ہے۔“

”کہاں ہے وہ جند کا درخت؟“ فروانے ایک طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

”اس آستانے کی پچھلی طرف بستی ہے، بس اسی آستانے اور بستی کے درمیان ایک بڑا سا جتڑ کا درخت ہے، مہر وہاں بیٹھی ہے۔“

”ماں باپ کو لڑکا پسند کیوں نہیں تھا، اس کے والدین کہاں ہیں؟“ فروا کے اندر تجسس پھیل

گیا۔

”اصل میں وہ لڑکا ادھر آستانے پر ہی رہتا تھا۔ سوائے بابا سائیں کے کوئی بھی اس کے بارے میں نہیں جانتا۔ اس کے ماں باپ کے بارے میں بھی کسی کو نہیں معلوم۔“ اس نے پر جوش

انداز میں بتایا

”کسی کو نہیں معلوم، تو کیا اسی وجہ سے مہر وکے والدین....“ وہ کہتے کہتے رُک گئی تو طفرنے

تیزی سے کہا



”کیوں؟ وہ کیوں نہیں ملیں گے؟“ اس نے تیکھے انداز میں پوچھا

”یہ تو میرا خیال ہے نا، پتہ کر لیتے ہیں، اگر آپ نے ان سے ملنا ہو تو۔“

”میں ان سے مل لوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر لے لئے خاموش ہوئی پھر بولی، ”اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دی گئی؟“

”جی، لوگ گئے تھے پوکیس کے پاس، لیکن کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔“

”کیوں نہیں ہوئی، کوئی وجہ؟“ اس نے پوچھا

”کیوں نہیں ہوئی اس کا ہمیں نہیں پتہ، اسی لئے آپ چینل والوں کو بلایا ہے کہ آپ دیکھیں کہ یہ مسئلہ کیا ہے۔“ ظفر نے کہا

”کیا یہ کچی بات ہے کہ وہ لڑکی دو دن سے وہیں بیٹھی ہے؟“ اس نے پھر سے تصدیق کی تو

ظفر بولا

”آپ خود جا کر اس سے پوچھ لیں۔“

فروا کو اس مہر و سے ایک دم ہمدردی ہونے لگی تھی۔ شاید یہ آستانے والے اس لڑکی کو بہکا رہے تھے، یادہ مہر و خود بہک گئی تھی۔ ممکن ہے اسے محبت ہو گئی ہو، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا وہ بابا سائیں سے بعد میں مل لے گی پہلے اسے مہر و سے ملنا چاہیئے۔ بابا اگر فراڈ ہوا تو

اس کی آمد کے بارے میں سن کر بھاگ جائے گا۔ وہ فوراً مہر و کو دیکھنا چاہتی تھی، اس لئے وہ ادھر بڑھ گئی۔

فروانے جنڈ کے درخت سے کچھ دور کار روک دی۔ اس نے کار سے اترتے ہوئے دیکھا، تنے سے ٹیک لگا کر سر جھکائے ایک پتلی سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ارد گرد کافی ساری مختلف عمر کی عورتیں موجود تھیں۔ وہ پرسکون انداز سے چلتے ہوئے اس کے پاس جا پہنچی اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے آہستگی سے بیٹھ گئی۔

لڑکی نے قیمتی پوشاک پہنی ہوئی تھی، جو دھول اوریت سے آٹ چکی تھی۔ عمر یہی بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ اس نے کافی سارا زیور پہنا ہوا تھا۔ نین نقش میں حسین تھی۔ بڑی بڑی بھنورا آنکھوں میں حیرت کے ساتھ انتظار پھیلا ہوا تھا۔ پتلے پتلے لب یوں بند تھے جیسے سلے ہوئے ہوں۔ ستواں ناک میں سونے کی کیل تھی، جس میں سرخ نگ جڑا ہوا تھا۔ اس کے گلابی چہرے پر پیلا ہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ فروا کو پہلی ہی نگاہ میں وہ بہت معصوم اور پیاری لگی۔ اس کے لباس میں چولستان کے روایتی ملبوسات کی جھلک تھی۔ سر پر بڑا سی چادر سے نکلی ہوئی زلف ہلکے ہلکے لہرا رہی تھی۔ فروا کو ایک دم سے ہی بلا وجہ اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگی تھی۔ لیکن ساتھ میں ہلکا ہلکا غصہ بھی امنڈ آیا تھا۔ ایک اجنبی کے لئے، اپنے ماں باپ کا نام وہ یوں بدنام کر رہی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی مہرونے سر اٹھا کر دیکھا تو فروانے پوچھا

”کیوں بیٹھی ہو یہاں؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔ مہرونے شاک نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور زہر خند لہجے میں پانگلوں کی طرح کہا

”تم کیوں پوچھ رہی ہو، اور تم آئی کیوں ہو یہاں پر؟ تماشہ دیکھنے، جو میں نے یہاں لگایا ہوا ہے؟“

مہرونے لہجے کچھ ایسا تھا کہ فروا نے سنجیدگی سے کہا

”نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ تمہارا یقین کس قدر پختہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”مطلب، یہ کہ تم ایسا کس لئے کر رہی ہو؟ ظلم کے خلاف احتجاج کر رہی ہو، کوئی چلہ کاٹ ہی ہو یا کوئی ڈرامہ کر رہی ہو؟“ فروا کے لہجے میں عجیب قسم کی تیزی تھی جیسے وہ طنز کر رہی ہے یا پھر اُسے یہ سب بہت برا لگا ہو یا پھر جیسے بہت زیادہ ہمدردی ہونے پر کوئی بندہ غصے میں بولتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ملا جلا تاثر تھا جس کی خود فروا کو بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ مہرونے اس کی طرف دیکھا اور انتہائی دکھی لہجے میں بولی

”تم نے کسی سے محبت کی ہے؟ ٹوٹ کر چاہا ہے کسی کو، وہ جسے تم اپنا سب کچھ سمجھ چکی ہو؟“

بولو جواب دو؟“ مہرونے پوچھا تو فروا کو لگا جیسے وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑی بات کر گئی ہے، کیا یہ کچھ پڑھی لکھی بھی ہے؟ کیا اس کے اندر موجود محبت نے اسے اس قدر طاقت و رندیا ہے؟

”دیکھو! میں تمہارے سوالوں کے جواب دینے نہیں آئی، میں صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟“

”میں اگر تمہیں جواب دے بھی دوں تو پھر کیا ہوگا، میرا جنید آجائے گا، صحیح سلامت، جیسے وہ یہاں تھا۔ تمہاری تو ایک خبر بنی ہے سنسنی خیز سی، اور بس۔ جبکہ میں احساسِ دلار ہی ہوں ان ظالموں کو، جنہوں نے ظلم کیا۔“ مہرونے کہا

”خبر بنائی نہیں جاتی، تمہارے جیسے لوگ ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے خبر بن جاتی ہے۔ اور جہاں تک خبر کی بات ہے وہ تو بن چکی ہے۔“

”تو پھر جاؤ اور جا کر چلاؤ اپنے چینل پر، یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔“ مہرونے غصے میں کہا

”وہ تو میں جاؤں گی، اور جو کرنا ہوگا میں کر لوں گی خیر! کیا تم کچھ پڑھی لکھی بھی ہوں؟“

فروانے اچانک ایک دوسری قسم کا سوال کر دیا، مہرونے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ پھیل

گئی اور پھر طنزیہ انداز سے بولی

”میٹرک کیا ہے۔ اور آگے پڑھنے نہیں دیا کہ لڑکیاں پڑھ کر کیا کریں گی“....

”مطلب پڑھی لکھی ہو..... پھر بھی تم“.....

”کیا پڑھی لکھی عورت کے ساتھ ظلم نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ تعلیم کوئی ڈھال ہے، جو ایسے کسی ظلم سے بچا لیتی ہے؟“ وہ تکیے لہجے میں بولی

فروا حیران تھی۔ روہی کی لڑکی، بھی پڑھی لکھی ہو سکتی ہے، یہ اس کے ذہن میں نہیں تھا۔
تبھی وہ آہستگی سے بولی

”لیکن میرا سوال اب بھی وہی ہے کہ تم کیوں....“

”جواب میں نے دے دیا ہے۔“ مہرونے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہارا یہی بیان ہم شوٹ کر لیں؟“ فروانے اجازت چاہی۔

”نہیں، میں قطعاً نہیں چاہوں گی۔ یہ میرا احتجاج ہے، میرے اپنوں کے خلاف۔ میں اسے دنیا کے سامنے نہیں ملانا چاہتی۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہاں سے مایوس جانا پڑے گا۔“

مہرونے سرد سے لہجے میں کہا

”کیا تمہیں یقین ہے کہ اس طرح کرنے سے، وہ چُپ سائیں یا میرا مطلب جنید واپس آ جائے گا۔ اور تمہاری شادی اس کے ساتھ ہو جائے گی؟“ فروانے پوچھا

”دیکھو۔! تم جو کوئی بھی ہو، یہ میرا یقین ہے کہ موت اور زندگی، رُب کے ہاتھ میں ہے۔ اگر جنید کی زندگی ہوئی تو وہ ضرور لوٹ کے آئے گا۔“ مہرونے پُر یقین لہجے میں کہا

”کیا تم اس جنید کے انتظار میں یہاں بیٹھی ہو؟“ اس نے پوچھا

”ہاں، میں اس وقت تک یہاں بیٹھی رہوں گی، جب تک مجھے اس کے یہاں آ جانے کا یقین نہیں ہو جاتا۔“ اس نے عزم سے کہا

”مہر۔! میں تمہیں سمجھانے نہیں آئی، لیکن تھوڑا لُجھ ضرور گئی ہوں، ایک طرف تم چینل پر خبر نہیں دینا چاہتی ہو، اور دوسری طرف یہاں بیٹھ کر کیا ماں باپ کا نام روشن کر رہی ہو، کیا وہ اس طرح علاقے میں بدنام نہیں ہوں گے؟“ فروانے واقعاً لُجھتے ہوئے پوچھا

”انہی علاقے والوں کو احساس دلانے کے لئے یہاں بیٹھی ہوں۔ لیکن تمہیں اس سے کیا؟ یہ میرا مسئلہ ہے، میں خود اسے حل کر لوں گی۔“ مہر نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ فروا سمجھ گئی کہ صدے کی وجہ سے ممکن ہے اس وقت وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی

”میں وہ ہوں، جو اس وقت تیرے جنید کا علاج اپنی نگرانی میں کروا رہی ہے۔ دیکھنا چاہتی ہو کہ وہ اب کیسا ہے؟“ فروانے ایک نفسیاتی حربہ آزمایا

”کیسا ہے وہ؟“ اس نے تیزی سے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا تو فروانے کیمرہ مین کو اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کیا کرنا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے کیمرے کی چھوٹی سی اسکرین پر اسے وہ ساری فلم دکھادی جو انہوں نے ہسپتال میں بنائی تھی۔ ان کے درمیان جو باتیں بھی ہوئی تھیں، پاس بیٹھی ہوئی کسی عورت نے مداخلت کرتے ہوئے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سب خاموش تھیں۔ ان کی آنکھوں میں محض تجسس تھا۔

”جب میں وہاں سے آئی تھی تو اسے خون کی سخت ضرورت تھی، وہ بے ہوش تھا۔ اسے دوا....“ فروانے کہنا چاہا مگر مہر و اس کی بات کاٹ کر بولی

”کوئی نہیں تھا اس کے پاس؟“

”یہاں کے کچھ لوگ تھے۔ لیکن وہ بے چارے کیا کرتے، خیر۔! میں نے سارا بندوبست کر دیا تھا، انشاء اللہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے کہا تو مہر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ بھگے ہوئے لہجے میں بولی

”بہت شکریہ،“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی پھر غصے میں بولی، ”تم نے اسے دیکھا ہے نا، کتنا ظلم کیا گیا ہے اس پر، پھر بھی کہتی ہو کہ میں یہاں کیوں بیٹھی ہوں۔ اب تو تمہیں سمجھ جانا چاہیئے۔“

”تو اس کا مطلب ہے جنید پر حملہ تمہارے والدین نے کروایا؟“ فروانے پوچھا

”تم خود سمجھ سکتی ہو۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کے پاس ایک کار آکر رکی۔ سبھی اس طرف دیکھنے لگے۔ فروانے دیکھا، کار میں سے ایک فربہ مائل ادھیڑ عمر عورت باہر نکلی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس نے

فروا کی طرف دیکھا اور پھر مہر و کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

”چل میری دھی، چل گھر، یوں دنیا کے سامنے تماشا نہ بنا، اپنے پیؤ کی کچھ تولاج رکھ۔“



”تو یقین کیوں نہیں کرتی ہے مہرو، بھائی خدا بخش نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ تو مانتی کیوں نہیں۔“

”ان کے علاوہ ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے۔“ مہرو نے لاپرواہی سے کہا

”دیکھو، اب ماں باپ دشمن ہو گئے۔“ پھوپھی روتے ہوئے بولی تو فروا نے کہا

”چلو۔! اٹھو، گھر چلو، میری بات مان لو، کیونکہ وہ کم از کم ایک ہفتے سے پہلے نہیں آسکتا، تم گھر بیٹھ کر دعا کرو اس کے لئے۔ اب کوئی تیرے ساتھ ظلم نہیں کر سکتا۔ تم جو چاہو گی وہی ہو گا۔“ فروا کی یقین دہانی تو کروادی لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ فروا سوچ رہی تھی کہ اب کیا کیا جائے۔ وہ مایوس ہونے والی نہیں تھی۔ اسے بہر حال ایک سٹوری نکالنا تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ کسی طرح مہرو پر اس کا اعتماد بحال ہو جائے تو اندر کی کوئی بات نکلے۔

وہ انہی خیالوں میں تھی کہ اسے سامنے سے ایک بزرگ سا بندہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سفید لمبی ریش، بھاری سفید مونچھیں، لمبے بال جو اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ سر پہ سیاہ پگڑی باندھی ہوئی تھی، ہاتھ میں عصا تھا۔ وہ قریب آکر بولا

”مہرودھی۔! اب تو پتر، گھر چلی جا، یا پھر میرے حجرے میں جا کر بیٹھ جا، وہاں بھی نہیں تو جنید کے اس گھر میں چلی جا، جہاں اس نے تجھے لے کر جانا تھا۔“ اس کی آواز بڑی بھاری اور گونج دار تھی۔ مہرونے ایک نگاہ اسے دیکھا اور بولی

”باباسائیں۔! کیا میں اب جنید کا انتظار چھوڑ دوں؟“

”میں نے کب کہا ہے کہ تو اس کا انتظار چھوڑ دے۔ میں نے تو یہاں سے اٹھ جانے کا کہا ہے، پتہ ہے اب دشمن اب اور طرح سے وار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میری دھی میری بات مان لے۔ مجھے اب شہر بھی تو جانا ہے نا جنید کے پاس۔۔۔ یہاں اب تیرا کون خیال رکھے گا۔ تو اس طرح ویرانے میں نہ بیٹھ۔ جا میری دھی تو جا گھر.... میں آکر سب دیکھ لوں گا....“ بابا سائیں نے پیار سے کہا تو مہرودھی نے ہنسی پر ہنسی گئی۔ وہاں موجود ہر چہرے پر خوشی کا تاثر پھیل گیا۔

”باباسائیں تو جنید کے پاس جا رہے نا؟“ مہرونے حسرت سے پوچھا۔ باباسائیں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا،

”میں شہر جا رہا ہوں، جنید کے پاس، تو کسی قسم کا فکر نہ کرنا۔ جا میرا پتر جا۔“ باباسائیں نے کہا اور واپس پلٹنے لگا تو فروانے جلدی سے کہا

”باباجی۔! اگر آپ کی بات یہ اتنی ہی مانتی تھی تو آپ نے اسے کل ہی یہاں سے کیوں نہیں اٹھا دیا۔“

بابائیں اس کی بات سن کے رک گیا، پھر اس کی طرف دیکھے بغیر بولا
 ”تو نہیں سمجھے گی، اور نہ ہی ابھی تمہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا سمجھانا پھر سہی،
 اس وقت مجھے جلدی ہے۔“ انہوں نے کہا اور پر سکون انداز میں چلتے چلے گئے۔ فروا اسے
 جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ مہر واٹھ چکی تھی۔ فروا آگے بڑھی اور اپنی کار میں بیٹھ گئی۔ تب تک
 پھوپھی مہر و کو اپنی کار میں بیٹھا چکی تھی۔ دوسری عورتیں پیدل ہی بستی کی جانب چل دی
 تھیں۔

ان کا سفر ایک بڑے سارے گھر کے سامنے ختم ہوا۔ وہ گھر بستی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ جس کے ساتھ ایک وسیع باڑہ تھا۔ ابھی بھی کچھ گائے، اونٹ اور بھیڑ بکریاں وہاں موجود تھیں۔ ڈیوڑھی پار کرنے کے بعد بڑا سارا صحن تھا، اس کے آگے لمبے دالان اور پھر کمرے۔ دو کمرے اوپر بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کمرے میں چلی گئی، جو مہر و کا تھا۔

”مہرو! تم نے اچھا کیا کہ بات مان کر گھر آگئی ہو۔“ فروانے کہا تو وہ بولی
 ”کیسے بات نہ مانتی، میں بابا سائیں کی بات ٹال ہی نہیں سکتی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے
 خاموش رہی پھر بولی، ”ویسے تو نے جنید پر نہیں مجھ پر احسان کیا ہے۔“

دودھ کی وجہ سے وہ خوشحال ہی نہیں پورے صحراچولستان میں مشہور کر دیا تھا۔ اس نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا، لیکن اس کے بغیر اس علاقے کی سیاست مکمل نہیں ہوتی تھی۔ اٹھنا بیٹھنا اس علاقے کے بڑے لوگوں میں تھا۔ سوا سے اولاد کو پڑھانے لکھانے کا شعور آگیا۔ پہلے پہل کار صرف انہی کے لئے خریدی گئی۔ سکول اور پھر کالج کے بعد اس کا بیٹا فرید تو لندن چلا گیا اور مہر و صرف قریب کے ایک سرکاری سکول تک پڑھ سکی۔ بستی نور دین سے شہر کا فاصلہ یہی کوئی بارہ کلومیٹر بنتا تھا۔ مہر و گھر میں رہتی جبکہ فرید شہزادوں کی طرح روزانہ کار میں جاتا اور واپس آ جاتا۔ وقت یوں ہی چلتا چلا گیا۔

مہر کو گھر کے چھوٹے چھوٹے کام ہی کرنا پڑتے تھے، ورنہ نوکرانیاں تھیں۔ اسے فراغت ہی فراغت تھی۔ وہ ٹی وی دیکھ لیتی یا پھر ناول اور افسانے ہی پڑھتی رہتی تھی۔ مہر خدا بخش کسی بڑے گھر میں اس کی شادی کرنے کی فکر میں تھا۔ کئی رشتے تھے، مگر وہ کسی ایک کو ہاں اس لئے نہیں کر رہا تھا کہ اسے اپنے بیٹے فرید کا انتظار تھا۔ اس کے واپس آنے میں چند ماہ رہ گئے تھے۔ یہ فیصلہ اس نے اپنے بیٹے کی آمد تک ٹال رکھا تھا۔ انہی دنوں ایک جمعرات مہر و قریبی دربار نور دین شاہ پر گئی۔ جمعرات ہو اور وہ بستی میں ہو، وہ دربار پر ضرور جاتی تھی، یہ اس کا بچپن سے معمول تھا۔

شام ہونے کو تھی، جب وہ اپنی نوکرائی کے ساتھ دربار پہنچی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے کافی حد تک گھٹن ہو رہی تھی۔ وہ دربار کے سرہانے کی طرف کھڑی تھی۔ اس کے سامنے پتھر کی جالی تھی، جس میں سے اندر مرقد کا سارا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ عورتیں اسی طرف جا کر دعا اور منت مانگتی تھیں۔ جالی پر بے شمار رنگین دھاگے بندھے ہوئے تھے۔ وہ اکثر ان بندھے دھاگوں کو دیکھتی۔ اُسے لگتا کہ یہ رنگین دھاگے نہیں بلکہ خواہشیں لٹک رہی ہیں۔ رنگین دھاگوں میں بندھیں ہوئی خواہشیں۔ اس شام وہ دعا مانگ چکی تو اس کی نگاہ ایک نوجوان پر پڑی، تب وہ خود پتھر ہو گئی۔ اسے اپنا آپ یاد ہی نہیں رہا۔ سیاہ شلوار قمیض میں ملبوس وہ نوجوان مرقد کے سرہانے دیا جلا رہا تھا۔ سرخ و سپید چہرے پر ہلکی ہلکی کالی سیاہ داڑھی اور مونچھیں، چوڑی پیشانی، لمباناک، پتلے پتلے ہونٹ، بڑی بڑی مخمور سی گہری بھوری آنکھیں، لمبی زلفیں، سر پر سفید ٹوپی بہت سج رہی تھی۔ وہ کھڑا ہوا تو لمبے قد پر چوڑا سینہ۔ وہ پہلی ہی نگاہ میں اس پر مر مٹی۔ شاید اس کے لاشعور میں ایسا کوئی آسیڈیل تھا یا کیا تھا، اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ سامنے کھڑا نوجوان ہر طرف سے بے نیاز دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ کوئی اس پر پوری جان سے مر مٹی ہے۔ وہ اسے مسلسل دیکھے چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ نوجوان وہاں سے چلا گیا۔ وہ نگاہوں سے اوچھل ہوا تو اسے

احساس ہوا کہ جیسے اس کا بہت کچھ گم ہو گیا ہو۔ وہ کتنی ہی دیر تک وہیں ساکت کھڑی رہی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے؟

”مہروبی بی چلیں؟“ اس کی نوکرانی نے اس سے پوچھا تو جیسے اسے ہوش آگیا۔

”ہاں چلیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے کہا، اور یہ کہہ کر وہ پلٹنے لگی تو نہ جانے اسے کیا خیال آیا۔ وہ رُک گئی۔ اس نے اپنی پراندے میں سے ایک سیاہ دھاگہ نکالا اور جالی پر باندھ دیا۔ اُن رنگین دھاگوں کے ساتھ، سفید جالی پر سیاہ دھاگا باندھتے ہوئے اس کے دل میں یہی منّت تھی کہ وہ نوجوان اُس کا ہو جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے ذہن میں دور دور تک یہ بات نہیں تھی۔

پوری رات وہ سونہ سکی تھی۔ اسی کا چہرہ نگاہوں میں گھومتا رہا۔ وہ کون تھا؟ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا۔ بس اس کا چہرہ نگاہوں سے نہیں ہٹتا تھا۔ اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اس کے من میں اتر گیا ہے۔ ہر لڑکی کے من میں ایک خواب ہوتا ہے، اور اس خواب میں بکھری ہوئی لاتعداد خوشیوں، اگر ان میں سے ایک بھی حقیقت میں مل جائے تو وہ دیوانی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی حال کچھ مہرو کا بھی تھا۔ اسکی زندگی میں بہت سارے لڑکے آئے تھے، کسی ایک کو بھی دیکھ کر دل یوں نہیں دھڑکا تھا، جس طرح اسے پا کر مچلتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل وہیں سفید جالی میں کہیں اٹک گیا ہے اور وہ سانس لینا بھول گئی ہے۔



وہ اگلی جمعرات کا انتظار نہ کر سکی۔ دو دن بعد ہی دربار چلی گئی۔ مہر و کی نگاہیں اس کی متلاشی تھیں۔ وہ آستانے کے احاطے میں اسے دیکھتی رہی، مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ مایوس ہو گئی۔ وہ سفید جالی کے پاس جا ٹھہری اور اپنی منتِ والے دھاگے کی گرہ دیکھتی رہی۔ ساری دنیا میں ایسی ہی خواہشوں کی گرہیں لگائی جاتی ہیں۔ انداز مختلف ہوتا ہے۔ کوئی کپڑے سے، کوئی دھاگے سے، کوئی تالے سے اور نجانے کیا کیا۔ وہ ان سب باتوں سے بے خبر اسی نوجوان کے بارے سوچتی ہوئی سفید جالی کے پاس سے پلٹ کر واپس جا رہی تھی کہ دربار کے احاطے میں درخت کے پاس، اسے وہ دکھائی دے گیا۔ اس نے وہی سیاہ شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پہ سفید جالی دار ٹوپی تھی۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور نجانے وہ کس خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دل سے مجبور ہو کر اس کے پاس چلی گئی۔ اس نے اپنے قریب کسی کا احساس کر کے آنکھیں کھول دیں۔ وہ نوجوان اسے دیکھ کر ایک دم سے چونک گیا تھا، جیسے اسے امید نہ ہو کہ وہ اس کے سامنے آسکتی ہے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تو مہر و نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک بڑا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ لو؟“

اس نے پہلے نوٹ کی طرف دیکھا اور پھر مہر و کی طرف اور دھیمے سے لہجے میں پوچھا ”یہ کیوں؟“

”تم یہاں دربار پر خدمت کرتے ہونا، یہ رکھ لو۔“ مہرونے کہا تو ایک دم سے مسکراتے دیا، پھر اپنی جیب سے ویسے ہی دو بڑے نوٹ نکال کر بولا

”میں دربار کا خدمت گار ضرور ہوں مگر۔! بھکاری نہیں ہوں۔ یہ نوٹ اس کے ساتھ ملاؤ، اور سامنے پڑے صندوق میں ڈال دو، مجھ سے زیادہ دربار کو اس کی ضرورت ہے۔“ اس کے یوں کہنے پر وہ حیران رہ گئی۔

”تو کیا تم اتنے امیر ہو کہ مدد قبول نہیں کرتے؟“ اس کے یوں پوچھنے پر مہر و کو ایک طرح سے خوشی بھی ہو رہی تھی، تب وہ بولا

”نہیں، امارت اور غربت کی بات نہیں، کہانا بھکاری نہیں ہوں۔ تمہارا شکریہ۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ مہرونے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھ لیا۔ اس نے چونک کر اسے غور سے دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا کر بولا

”مجھے جنید کہتے ہیں۔“

”مجھے جنید کہتے ہیں۔“

”اور میرا نام مہر ہے۔ میں ہر جمعرات کو یہاں آتی ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا
 ”مگر آج تو جمعرات نہیں ہے۔“ اس نے نیچی نگاہ سے کہا تو مہر وکا دل چاہا کہ کہہ دے کہ
 میں تو فقط تیری تلاش میں یہاں تک آئی تھی۔ لیکن وہ کہہ نہ پائی۔ اس نے وہ نوٹ اپنے پاس

”مگر آج تو جمعرات نہیں ہے۔“ اس نے بچی نگاہ سے کہا تو مہر وکاد دل چاہا کہ کہہ دے کہ میں تو فقط تیری تلاش میں یہاں تک آئی تھی۔ لیکن وہ کہہ نہ پائی۔ اس نے وہ نوٹ اپنے پاس



کھڑی نوکرانی کو دیئے تاکہ وہ صندوق میں ڈال آئے۔ وہ چلی گئی تو مہرو اپنے دل کی بات چھپاتے ہوئے بولی

”ایک منٹ ہے، رب کرے وہ پوری ہو جائے۔ اسی لئے یہاں آئی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے کی پھر جھجھکتے ہوئے پوچھا، ”کیا تم یہیں ہوتے ہو؟ پہلے کبھی نہیں دیکھا تمہیں یہاں؟“

میں، ”ایک لفظ کہہ کر وہ چپ ہو گیا، پھر جیسے سوچ کر بولا، ”میں بس ایک راستے کا راہی ہوں، اور اپنی منزل کو پالینا چاہتا ہوں، پتہ نہیں وہ کب ملتی ہے۔“

مہرو اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کی منزل کیا ہے، اس نے کچھ کہنے کے لئے لب و لہجہ کئے تھے کہ جنید نے ہاتھ بڑھا کر کچھ بھی نہ کہنے کا اشارہ کر دیا، پھر اٹھا اور اندر حجرے کی طرف چلا گیا۔ مہرو اسے جاتا ہوا دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ چلا گیا تو اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا ”اس کی منزل، کون ہے اس کی منزل؟“

”بی بی جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ پاس کھڑی نوکرانی نے پوچھا تو وہ اپنے حواسوں میں آگئی۔

”نہیں، کچھ نہیں۔ آؤ چلیں۔“

وہ دونوں دربار کی سیڑھیاں اترتی چلی گئیں۔ مہر و کو لگا آج وہ اپنا دل ہی نہیں حواس بھی یہاں کھو چلی ہے۔

اس نے آنے والی جمعرات کا بہت انتظار کیا۔ وہ صبح ہی سے شام ہو جانے کا انتظار کرنے لگی۔ ابھی سہ پہر ہی تھی کہ وہ اپنی نوکرانی کو لے کر دربار کی طرف چل دی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی اس کی پہلی نگاہ ہی وہیں دیوار کے پاس پڑی، جہاں وہ اس دن بیٹھا ہوا تھا۔ آج بھی وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں سیڑھیوں کی طرف ہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی جنید کا چہرہ تن گیا۔ مہر کو نجانے کیوں لگا کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا ہے۔ رب تعالیٰ نے عورت کو کہ اس وصف سے نوازا ہوا ہے کہ مرد کی آنکھ کو پڑھ لیتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کا اظہار نہ کرے۔

وہ اس کے قریب چلی گئی اور جا کر پوچھا، ”کیا تم یہیں بیٹھے رہتے ہو؟“

”ہاں۔! یہاں کی خدمت سے جو وقت بچ رہتا ہے، میں یہیں بیٹھ رہتا ہوں۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں جواب دیا تو اس نے بے ساختہ پوچھا

”کیوں؟“

”یہ تو بالکل ایسا ہی سوال ہے کیسے کہ میں یہ پوچھ لوں کہ تم یہاں کیوں آتی ہو۔“

”ہاں تم پوچھ سکتے ہو، میں تو اپنے کسی مقصد سے آتی ہوں، بتایا تھا نا کہ میری ایک منت ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا تو انتہائی سنجیدگی سے بولا



”اور میں بھی اپنے مقصد کے لئے یہاں بیٹھا ہوں۔“

”کہیں ہم دونوں کا مقصد ایک ہی تو نہیں ہے؟“ مہرونے یوں پوچھا جیسے وہ اپنے دل کی
ت کہہ رہی ہو۔

”نہیں ایسا نہیں ہے۔“ اس نے سختی سے کہا تو مہر و دل مسوس کر رہ گئی۔

”کون ہو سکتی ہے اسکی منزل۔۔۔ اس کا مقصد؟“ اس نے سوچا اور پھر یہ سوچ بگو لے کی طرح اس کے دماغ میں اٹھ گئی۔ کہیں یہ کسی دوسری لڑکی سے تو محبت نہیں کرتا، جیسے میں نے منت مانی ہوئی ہے، اس نے بھی کسی کو پانے کی منت مانی ہو؟ یہ سوچا تو نجانے کیا کچھ اس کی لپیٹ میں آیا۔ وہ کچھ دیر آستانے میں رہی اور پھر واپس گھر لوٹ گئی۔ مہر واکچین لٹ گیا تھا۔

☆ . . . ☆ . . . ☆

مہر و دربار پر روزانہ جانے لگی تھی۔ وہ ہوتی اور اس کے ساتھ اس کی نوکرانی، دونوں سرشام وہاں جا پہنچتی تھیں۔ جنید ان کا انتظار کرنے لگا تھا۔ اب وہ صحن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر نہیں بیٹھا تھا، بلکہ وہ بابا سائیں کے حجرے میں ہوتا۔ مہر و نے کبھی بابا سائیں کو حجرے میں نہیں دیکھا تھا۔ مہر و اور جنید، کچھ فاصلے پر بیٹھے رہتے اور ان کے درمیان کچھ دیر باتیں



ہوتیں۔ پیاس بجھتی بھی نہ تھی کہ اگلے دن کا انتظار شروع ہو جاتا تھا۔ پیاس تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

جنید کی دید اور قرب کی شدید پیاس مہر و کے اندر بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ایک رات جب کہ چاندنی اپنے مسحور کن جادو کے ساتھ ہر شے پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نیند تو نجانے کتنے دنوں سے اڑ چکی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی اٹھے اور سیدھی دربار چلی جائے جہاں اس کا جنید تھا۔ اس سے ملنے کی خواہش اس کے دل میں شدید تر ہوتی چلی گئی۔ وہ نجانے اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔ اس کی آنکھوں میں بھی نیند ہوتی ہے یا نہیں، کیا وہ بھی میری طرح محبت کو محسوس کرتا ہے؟ وہ ایک دم ہی سے بے چین ہو گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ سب سو رہے تھے۔ وہ اٹھی اور گھر سے نکلتی چلی گئی۔ سنسان راستہ اور بستی میں ہو کا عالم تھا۔ اسے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اور ہوتا بھی کیسے؟ اس تو تمام تر دھیان جنید کی طرف لگا ہوا تھا۔ اسے کسی دوسری شے کی پروا ہی نہیں تھی۔ خواجہ گلام فرید سرکار نے ایسے ہی کسی وقت کے لئے بہت خوبصورت شعر کہے ہیں کہ وِج رو ہی دے را ہندیاں.... نازک ناز و جٹیاں.... راتیں کر ن شکارِ دیس دے.... ڈیہنہ و لوڈن مٹیاں۔ (رو ہی میں ایسی نازک اور ناز والی لڑکیاں رہتی ہیں کہ دن کے وقت تو دودھ سے مکھن نکالتی ہیں اور رات کو وہ دلوں کا شکار کرنے نکل پڑتی ہیں)

وہ دربار پہنچ گئی۔ آستانہ خالی تھا۔ صحن میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہاں مگر جنید اسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ وہ کسی ہیولے کی مانند دکھائی دے رہا تھا، جبکہ مہرونے تو اسے ایک نگاہ ہی میں پہچان لیا تھا۔ وہ اس کے قریب چلی گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔ اچانک ہی کسی کے قرب کا احساس پا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مہرو پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک گیا۔

پھر ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا

”مہرو۔! خیر تو ہے، تم اس وقت یہاں؟“

”بس، میرا دل کیا تھا تمہیں دیکھنے کو، چلی آئی۔“ مہرونے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں یوں کہا، جیسے وہ خود نہ کہہ رہی ہو بلکہ ٹرانس میں ہو۔ جنید کچھ دیر خاموش رہا، پھر بڑے گھمبیر لہجے میں بولا

”مہر و! مجھے یہ بتاؤ، کیا ہمارے من میں کوئی کھوٹ ہے؟“

”نہیں تو، ہمارا تعلق تو بہت پاک اور صاف ہے؟“ مہرونے سارے جہان کا پیار اپنے لہجے

میں سمیٹتے ہوئے کہا

”تو پھر ہمیں یوں راتوں کو چھپ کر نہیں ملنا چاہئے۔ ہمارے من میں اُجالا ہے، روشن اور چمکتے ہوئے دن کی طرح۔ ہمیں دن ہی میں ایک دوسرے کو ملنا چاہئے۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا



”میں تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔۔۔“ مہرونے کہنا چاہا، مگر اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا

”میں اپنی محبت کو دنیا والوں کی آنکھ سے میلا ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا۔ اپنے دل پہ قابور کھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ دھیرے سے بولا

”جنید! یہ میں ہی جانتی ہوں کہ میرے دل میں تمہارے لئے کتنی محبت ہے۔ یہ تم پر احسان نہیں ہے۔ یہ میرے دل کی لگی ہے اور یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنے والدین کو ایک بار ہمارے گھر بھیج دو۔“ اس نے آہستگی سے کہا تو تیزی سے بولا

”اور جس کے والدین ہی نہ ہوں تمہیں مانگنے کے لئے تو پھر؟“ جنید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس پر مہرونے چونک کر اسے دیکھا اور تیزی سے پوچھا۔
”کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟“

”ہاں ہے، شاید تم سے بھی زیادہ۔“ جنید نے یوں کہا جیسے یہ لفظ اس کے دل سے نکلے ہوں۔ بہت اثر تھا ان میں۔ مہر پور پور بھگ گئی تھی۔ تبھی وہ بولی
”تو پھر، کیا کیا جائے جنید، میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”دیکھو مہرو! تمہیں حاصل کرنے کے لئے، یہیں کوئی غلط راستہ تو اپناؤں گا نہیں، لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ اگر تو میری قسمت میں ہوئی ناتو میں تجھے پالوں گا۔“ اس نے شائستگی سے اسے سمجھایا تو وہ دھیمے لہجے میں بولی

”قسمت ہم خود بھی بنا سکتے ہیں، یہ قسمت تو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم چاہیں تو۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ لمحے بعد وہ بولا

”بے شک کوشش ہی سے انسان کو ملتا ہے، لیکن اٹل فیصلے اوپر بھی ہوتے ہیں، جیسے یہ کوشش کرنے والا فیصلہ بھی۔ ہم کوشش کریں گے۔ ضرور کریں گے، لیکن یہ کوشش ایسی ہوگی، جو میرے رب اور دنیا کے نزدیک درست ہوگی۔ باقی رب جانے۔“ جنید نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے کہا

”تم پھر کیا کرنا ہو گا جنید؟“ مہرونے جذباتی لہجے میں پوچھا

”میں بابا سائیں سے بات کروں گا۔ انہیں تمہارے گھر بھیجوں گا، پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔“ اس نے حوصلہ دیا۔

”میں انتظار کروں گی جنید۔“ اس نے پرسکون ہوتے ہوئے کہا اور اٹھنے لگی، تب وہ آہستگی سے بولا

”مہر۔! ممکن ہے اب تم دربار پر دوبارہ نہ آسکو۔ بابا سائیں نے اگر بات کی تو ساری بات ہی کھل جائے گی۔“

”ہاں میں سمجھتی ہوں۔“ مہرونے خود پر جبر کرتے ہوئے کہا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی بڑی ساری چادر سمیٹی اور باہر کی جانب چل دی۔

اگلی صبح باباسائیں ان کے گھر اکیلے ہی آگئے۔ وہ سبھی دالان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مہرو کا باپ مہر خدا بخش، اس کی شرمایاں، پھوپھی پیر و زائیاں اور وہ خود۔ سبھی نے حیرت اور خوشی سے اس کا استقبال کیا۔ وہ حیران اس بات پر تھے کہ باباسائیں کبھی کسی کے گھر نہیں گئے، یہ آج ان کے گھر کیسے آگئے ہیں۔ مہرو اس لئے حیران تھی کہ باباسائیں اس قدر جلدی اس کے گھر آجائیں گے۔ وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ انہوں نے بڑی عزت اور احترام سے باباسائیں کو بٹھایا۔

”آج تو بڑا بھاگاں والا دن ہے کہ آپ ہمارے گھر آگئے ہیں۔“ مہر خدا بخش نے خوشی اور احترام سے کہا

”ہاں خدا بخش، آج میں جس کام کے لئے آیا ہوں، اس کے لئے مجھے تیرے گھر آنا ہی تھا۔“ بابا سائیں نے گہری سنجیدگی سے کہا

”ایسا کیا کام ہے بابا سائیں۔ مجھے بلو الیا ہوتا۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا



”خدا بخش۔! تو نے مجھے دیکھا، اپنے بچپن سے دیکھا، کیسا پایا ہے تو نے مجھے؟“ بابا سائیں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا

”یہ کیا بات کر رہے ہیں آپ، کون عزت نہیں کرتا آپ کی۔ سب جانتے ہیں کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ کسی کو دُکھ نہیں دیا آپ نے۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا

”تو پھر تو نے صرف میری ذات کو دیکھنا ہے، میں تم سے ایک سوال کرنے لگا ہوں۔ فوراً جواب نہیں دینا، بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا۔“ بابا سائیں گھمبیر لہجے میں بولے

”ایسی کیا بات ہے بابا سائیں؟“ خدا بخش نے پوچھا

”ایسی کیا بات ہے بابا سائیں؟“ خدا بخش نے پوچھا

”میں بیٹی مہر و کو جنید کے لئے مانگتا ہوں۔“ بابا سائیں نے کہا تو یوں لگا جیسے وقت رُک گیا ہو۔ وہ اس سوال پر سبھی ساکت ہو گئے تھے۔ کافی دیر بعد پیر و زراں مائی نے جھجھکتے ہوئے پوچھا

”بابا سائیں! یہ کیا بات کر رہے ہیں آپ، یہ جنید وہی لڑکا نہیں ہے جو کچھ عرصے سے آستانے پر پڑا رہتا ہے؟“

”ہاں وہی ہے۔“ بابا سائیں نے آہستگی سے کہا



ہے۔ اور سنو! میرا سب کچھ اسی جنید کا ہے۔ جتنا مال چاہو، میں دوں گا، اور یہ جان لو کہ وہ بھکاری نہیں ہے، پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ اور میں یہ بھی بتا دوں کہ مہر بیٹی کی بھی خوشی اسی میں ہے۔ اب آگے تم لوگ سوچو۔“ بابا سائیں نے کہا تو ان پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

یہ کیا ہو گیا؟

”کیا ہماری مہر۔۔۔“ پیروزاں نے اٹکتے ہوئے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ دالان میں ستون کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے اقرار میں سر ہلادیا۔ تو اُن کو جیسے دنیا گھوم کر رہ گئی۔

”دیکھو خدا بخش، اب سوچنا تمہارا کام ہے۔ تم جو کوئی بھی شرط رکھو گے، میں وہ پوری کروں گا، میں چاہوں گا کہ تم مجھے ناامید نہ کرو۔“ بابا سائیں نے کہا اور اٹھنے لگا۔ تبھی خدا بخش نے کہا

”مجھے سوچنے کا وقت دو بابا سائیں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔ اور ایک بات اور یاد رکھنا، تم اگر مہر و کو میری بیٹی نہ بنانا چاہو، تو دباؤ نہیں ہے۔ تم جو فیصلہ بھی کرو، بہت سوچ سمجھ کر کرنا، میں تیرے فیصلے کا احترام کروں گا۔“ بابا سائیں نے کہا اور اٹھ گیا۔ خدا بخش کی بیوی جو بابا سائیں کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرنے کے لئے اٹھ گئی تھی، وہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ جس وقت وہ واپس آئی، بابا سائیں بچا چکا تھا۔ جب اسے بابا سائیں کی آمد بارے پتہ چلا تو وہ غصے میں آگئی۔

”وہ کون ہوتا ہے میری بیٹی کے بارے میں ایسی بات کرنے والا۔ تم لوگوں نے اسے سیدھے سیدھے جو ب دے کر کیوں نہیں بھیجا۔ اس نے ایسی بات کرنے کی جرات کیسے کی؟“

”یہ تیری مہر، اس کی وجہ سے اسے یہ بات کرنے کا حوصلہ ملا ہے۔ پوچھ اس سے کیوں کیا ہے اس نے ایسا؟“ پیروزاں نے بھی غصے میں کہا تو خدا بخش بولا

”بس۔! تم دونوں ہی اس سے پوچھ لو، یہ کیا چاہتی ہے۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے بابا سائیں کو حوصلہ ہوا کہ وہ مجھ سے اتنی بڑی بات کہہ سکے۔“ یہ کہہ کر اس نے غصے بھری نگاہوں سے پیروزاں کی طرف دیکھا اور پھر بولا، ”اور خاص طور پر تم پیروزاں۔ تم سن لو۔۔۔“

”لیکن سائیں تم کیا جواب دو گے بابا سائیں کو؟“ شرماں مائی نے تیزی سے پوچھا

”خاموش۔! منہ سے ایک لفظ نہیں نکالنا۔ اسی نے بتانا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ خدا بخش نے کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا اور وہ دونوں مہر کی طرف بڑھ گئیں۔

”تو نے ہمارے اعتماد کا خون کر دیا ہے مہر۔“ اس کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔

”اب بھی سنبھل جاؤ، اپنے باپ سے معافی مانگ لو، ابھی تو بات گھر ہی میں ہے۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔“ پیروزاں پھوپھی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”میں جان تو دے سکتی ہوں، مگر اسے بھول نہیں سکتی۔“

”تو پھر تمہیں جان ہی دینا ہو گی۔“ اس کی ماں نے کہا اور اسے دھکیل کر کمرے میں پھینک دیا۔

دو دن تک وہ دونوں مہر کو سمجھاتی رہیں۔ مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ اس کی شادی ہو گی تو جنید کے ساتھ ورنہ وہ ساری عمر شادی نہیں کرے گی۔ تم لوگ مجھے مارنا چاہو تو مار سکتے ہو۔ اس کی ضد دیکھ کر ان کے دل میں خوف بیٹھ گیا کہ کہیں یہ مہر اس اجنبی کے ساتھ بھاگ ہی نہ جائے۔ ان دو دونوں میں خدا بخش نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بالکل ہی خاموش ہو گیا تھا، جیسے وہ کسی بڑے صدمے سے گزر رہا ہو۔

تیسرے دن اُس نے پیروزاں اور شرماں کو اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا

”کیا کہتی ہے مہر؟“

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہیں تو خدا بخش نے اپنا سوال دہرا دیا۔ اس کے لہجے میں نجانے ایسا کیا تھا کہ وہ سہم گئیں تھیں۔ تبھی پیروزاں نے ہمت کر کے کہا

”بھائی، نجانے اس نے مہر پر کیا جادو ٹونہ کر دیا ہے، وہ تو بالکل ہی پاگل ہو گئی ہے۔“

”مطلب، وہ جنید ہی سے شادی کرنا چاہتی ہے؟“ اس نے تصدیق چاہی۔

”وہ یہی کہہ رہی ہے۔ میری مانو تو۔۔۔“ پیروزاں نے کوئی صلاح دینا چاہی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور بولا

”بس، مہر کی شادی اب اسی سے ہوگی۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور سیدھا دربار چلا گیا۔ بابا سائیں اس وقت اپنے حجرے میں تھا اور جنید کنویں سے پانی نکال کر حوض بھر رہا تھا۔ وہ حجرے میں چلا گیا۔ بابا سائیں اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔

بڑے تپاک سے ملا اور اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے پوچھا

”بول خدا بخش، کیا کہتا ہے؟“

”مجھے آپ کی بات منظور ہے۔ یہاں مہر و آپ کو دی۔“

”تیرا بھلا کرے۔ تم دیکھنا بیٹی اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔“

”آپ بس چار لوگوں کے ساتھ آجائیں اور اس کا نکاح لے لیں۔“ خدا بخش نے کسی بھی جذبے سے عاری لہجے میں کہا تو بابا سائیں چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھتا رہا، پھر بڑے سکون سے پوچھا

”خدا بخش، کیا تو یہ ناطہ خوشی سے نہیں جوڑ رہا؟“

”اس میں اب خوشی یا غمی کی کیا بات رہ گئی ہے بابا سائیں، میری بیٹی کا فیصلہ ہے، میں اب کیا

کہہ سکتا ہوں۔ میں نے اس کی شادی کہیں نہ کہیں تو کرنا تھی، اس جنید کے ساتھ سہی۔“

”اگر تم چاہو خدا بخش، وہ تمہارا بیٹا بن کر تیرے پاس رہے گا، تیرا بازو بن جائے گا۔“



”نہیں بابا سائیں، اس کا جہاں دل چاہے رہے، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ خدا بخش نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا

”کب آئیں؟“ بابا سائیں نے پوچھا

”جب آپ چائیں۔ میری طرف سے کل آجائیں۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہا

”ٹھیک ہے ہم کل ہی آجاتے ہیں۔“ بابا سائیں نے کہا تو خدا بخش وہاں سے مزید کوئی بات

کنے اُٹھ کر آگیا۔

در بار سے ذرا ہٹ کر اور بستی سے پہلے ہی ایک ڈیرہ تھا۔ کافی کھلا تھا اور اس میں تین بڑے بڑے کچے کوٹھے تھے۔ وہاں در بار پر لائے گئے مٹ کے جانور باندھے جاتے تھے۔ باباسائیں نے وہ صاف کروایا۔ اسی کو ایک گھر بنانے کی کوشش میں کچھ سامان لا رکھا۔ نیا مکان بن جانے تک جنید کو وہاں رہنا تھا، مہر و کے ساتھ۔ اور اگلے دن جنید کی بارات وہاں سے ہی نکلنا تھی۔

بابائیں صبح صبح ہی خدا بخش کے گھر پہنچ گئے تھے۔ وہاں سوگ کا سا ماحول تھا۔ مہر واپسے کمرے میں پڑی رو رہی تھی۔ اس کی کچھ سہیلیاں آگئی تھیں، جنہیں پیروزاں نے ہی بلوایا تھا۔ وہ اسے تیار کر رہی تھیں۔ بستی کے کچھ لوگ باہر کھلے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سبھی خاموش تھے اور بارات کا انتظار کر رہے تھے۔



جنید کی بارات کیا تھی۔ اس کے ساتھ پانچ بندے تھے۔ وہ سبھی پیدل چلے جا رہے تھے۔ ان کے درمیان بھی خاموشی تھی۔ اس وقت وہ بستی سے ذرا فاصلے پر تھے، جب اچانک ایک طرف سے سیاہ نور و ہیل کیبن آیا۔ اس میں کافی سارے لوگ تھے۔ انہوں نے بارات کے پاس گاڑی روک دی۔ تبھی گاڑی میں سے بندے باہر نکلے اور تیزی سے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سے چند لوگوں کے ہاتھ میں اسلحہ تھا۔ ان بندوں میں سے ایک نے جاتے ہی جنید کو پکڑ لیا اور اونچی آواز میں بولا

”تم سب واپس پلٹ جاؤ، ہمیں تم میں سے کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں، بھاگ جاؤ یہاں سے۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“ جنید نے کڑکتے ہوئے کہا

”حکم صرف اتنا ہے کہ تمہیں بس جان سے نہیں مارنا، باقی دیکھو کیا ہوتا ہے تیرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر اس نے پوری قوت سے گھونسہ اس کے منہ پر دے مارا۔ بارات کے لوگ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ گاڑی میں آئے ہوئے پانچ چھ بندے اس پر پل پڑے۔ جنید نے اگرچہ خاصی مزاحمت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ انہوں نے گن کے بٹ اس کے سر پر مارے، اس کی ٹانگیں اور بازو توڑنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ جب وہ نڈھال ہو کر زمین

پر گر گیا تو انہوں نے ہاتھ روک لیا۔ جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے تو واپس گاڑی میں بیٹھے اور جس طرف سے آئے تھے ادھر نکل گئے۔

ایک دم ہی شور مچ گیا۔ مہر کے کان میں یہی آواز پڑی کہ جنید کو مار دیا گیا ہے۔ اس نے جیسے ہی سنا تو اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ بھاگ کر باہر نکل آئی۔ اس وقت تک صحن میں موجود سارے لوگ باہر جا چکے تھے۔ بستی کے لوگ بھی اسی طرف جا رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے اس سمت جا رہی تھی کہ مہر کو اس کی ماں شرماں مائی نے پکڑ لیا۔

”مجھے جانے دو، میں جنید کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا

”اسے شہر کے ہسپتال لے گئے ہیں۔ وہ اب وہاں پر نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا وہ ابھی زندہ ہے؟“ اس نے تصدیق چاہی۔ کچھ دیر بعد اسے یقین ہو گیا کہ لوگ اسے شہر کے ہسپتال لے گئے ہیں، ابھی وہ زندہ ہے۔ وہ اپنے گھر تو واپس آگئی لیکن وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کے باپ نے کیوں اس شادی کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آئی، اس نے دلہن والا لباس پہنا اور اسی سمت چل دی جہاں جنید کو مارا گیا تھا۔ سبھی حیران تھے کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔ بہت سارے لوگ دربار پر جمع تھے، جن میں اس کا باپ خدا بخش بھی تھا۔ ان لوگوں کو بھی پتہ چل گیا کہ مہر و دلہن والا لباس پہن کر جا رہی ہے تو وہ بھی بھاگے۔

باباسائیں اپنے حجرے میں تھیں۔ انہیں جب پتہ چلا تو وہ بھی باہر نکل آئے۔ وہ چلتے ہوئے وہاں آگئے جہاں جنڈ کے درخت تلے مہرو بیٹھی ہوئی تھی اور خدا بخش کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور اس کی پھوپھی پیر و زالاں اسے گھر چلے جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ مگر وہ خاموش تھی۔ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ تبھی باباسائیں اس کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور بولے

”مہر و کو چھوڑ دو اور پرے ہو جاؤ۔“ ان کی آواز فضا میں گونجی تو سبھی ایک طرف ہو گئے۔ بابا سائیں کچھ دیر مہر و کو دیکھتا رہا، پھر اس نے خدا بخش کی طرف دیکھ کر کہا، ”تمہیں ایک موقعہ دیا تھا، مگر لگتا ہے تم نہیں سمجھو گے۔ جاؤ اب چلے جاؤ، مہر و، میری بیٹی کو تنگ مت کرو، جو اس کا جی چاہتا ہے وہی کرنے دو، جاؤ۔“

”بابا سائیں۔! ایسا مت کہو۔۔۔ یہ میرا نہیں میری برادری کا فیصلہ ہے۔“

”پھر تم بھی سن لو۔۔۔ تم نے خود مہر و کو میری بیٹی بنانے کا فیصلہ کیا، اور میرے ساتھ وعدہ کیا۔۔۔ اس وقت برادری کہان تھی۔ اب میں دیکھتا ہوں۔۔۔ کون مہر و کو یہاں سے اٹھاتا ہے۔۔۔ خدا بخش۔۔۔ اب تم اپنی بیٹی پر سے اپنا حق کھو چکے ہو۔۔۔“

خدا بخش نے غصے میں پہلے مہر کو پھر بابا سائیں کو دیکھا اور سر جھٹکتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ پیر و زماں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ بابا سائیں نے عورتوں سے کہہ دیا کہ یہ جب تک یہاں ہے اس کے پاس رہو۔ کسی کے بھی گمان میں نہیں تھا کہ مہر و دودن اور دورا تیں وہاں بیٹھی رہے

گی۔ پہلے دن وہ گم سم رہی۔ کسی سے بات تک نہ کی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اندر غصہ ابنے لگا۔ وہ جنید کی آمد تک وہیں بیٹھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا یہ احتجاج دے گا کہ وہ جنید کے لئے کس قدر مخلص ہے۔

☆ . . . ☆ . . . ☆

”تو اس کا مطلب ہے یہ تمہارے باپ نے کیا ہے، تم اس کے خلاف احتجاج بھی کر رہی ہو اور مجھے یہ خبر چلانے کی بھی اجازت نہیں دے رہی ہو۔“ فروانے اس سے الجھتے ہوئے کہا

”دیکھو میں تمہیں روک نہیں سکتی، تم جو چاہو سو کر سکتی ہو، لیکن وہ پھر بھی میرا باپ ہے، باقی رہا میرا احتجاج، وہ میرا اور میرے باپ کا معاملہ ہے۔ اور پھر تم نے مجھ سے وعدہ بھی کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں پوری کوشش کروں گی کہ خبر نہ چلے۔“ یہ کہتے ہوئے فروانے اٹھتے ہوئے اپنا کارڈ اسے دیا اور بولی۔ ”یہ میرا رابطہ نمبر ہے، کوئی بھی بات ہو مجھے اطلاع کر دینا۔ فون تو ہو گا تا تمہارے پاس؟“

”فون تو نہیں ہے اور نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن اگر بہت ضروری ہو تو کال کر لوں گی،“ اس نے کارڈ پکڑتے ہوئے کہا۔ پھر ایک دم سے بولی، ”ٹھہرو۔! ایک منٹ“ یہ کہہ کر وہ کوئی بات سنے بغیر ایک الماری کی طرف گئی، جلدی جلدی میں اس نے کچھ اٹھایا اور پلٹی تو اس

کے ہاتھ میں کافی سارے نوٹ تھے۔ وہ اس کی طرف بڑھا کر بولی، ”یہ لو، میرے جنید کے
علاج پر یہ سارے خرچ کر دینا۔ یہ کم ہیں تو میں یہ زیور۔۔۔“

”تم یہ نوٹ اپنے پاس رکھو، اس کے علاج کا بندوبست ہو گیا ہوا ہے۔ اور پھر میں ہوں وہاں
پر۔“ یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف لپکی۔

فرواد وہاں سے نکل پڑی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خدا بخش سے ملے، اس سے بات کرے، اس کا
بھی پوائنٹ آف ویو جانے۔ مگر اسے یہ خبر چلانا ہی نہیں تھی۔ اگرچہ اس خبر کو بہت سارے
رنگ دے کر سنسی خیز مواد بنایا جاسکتا تھا، لیکن نجانے کیوں وہ اسے نظر انداز کر دینا چاہتی
تھی۔ شاید وہ خدا بخش سے بات کر لیتی، وہ گھر آیا ہی نہیں اور نہ ہی اس سے ملا۔ وہ بستی سے
نکل پڑی تھی۔ راستے ہی میں دربار پڑتا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ایک نگاہ ان جگہوں کو تو دیکھ
لے جہاں ان دودلوں میں محبت پروان چڑھی تھی۔ اور پھر لگے ہاتھوں وہ بابائیں سے بھی
مل لے۔ وہ کیا کہتا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے معلوم ہو کہ آخر جنید کون تھا؟ وہ تو اس کے بارے
میں جانتا ہوگا، ورنہ کون اس قدر اعتماد کرتا ہے۔ اس نے دربار کے سامنے کار کو آئی اور
سیڑھیاں چڑھ کر آستانے کے احاطے میں آگئی۔ اسے وہاں کئی فقیر اور ملنگ نما لوگ دکھائی
دیئے، اس نے ایک کو بلوایا اور اس سے بابائیں کے بارے میں پوچھا
”وہ تو یہاں نہیں ہیں۔“

اس فقیر نما ملنگ نے اس کی توقع کے مطابق جواب دیا تو فروانے پوچھا
”کہاں گئے ہیں؟“

”شہر گئے ہیں جنید کے پاس۔“

”اوہ اچھا،“ اس نے کہا اور ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ کیمرہ مین نے اس سے منظر کو قید کرنے لگا تھا، وہ منظر کشی کر چکا تو فروا واپس کار کی جانب چلی گئی۔ سہ پہر سے پہلے وہ اپنے آفس پہنچ گئی۔ وہ سیدھی اپنے باس کے کمرے میں گئی۔ وہ اس کا منتظر تھا۔ اس نے تجسس سے پوچھا

”ہاں، تو کیسی رہی وہ سٹوری؟“

”سر۔! وہ واقعہ تو سچ ہے، لیکن اس میں کوئی چارم نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس پر آدھے منٹ کی خبر بھی نہیں دی جاسکتی۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا
”تم، فروا یہ تم کہہ رہی ہو؟“ باس نے حیرت سے پوچھا

”ہاں سر میں کہہ رہی ہوں۔ اور پھر یہ خبر ادھوی ہے سر، اہم بندہ ابھی ہسپتال میں ہے، اس کا موقف کیا ہے۔ بالکل ادھ کچری سی خبر ہوگی۔ لڑکی کا باپ بھی نہیں ملا اور وہ لڑکی خود نہیں چاہتی کہ اس کے بارے میں کوئی خبر چلائی جائے۔“ فروانے تھکے ہوئے انداز میں کہا تو باس بولا

”لوگ کچھ نہ ہونے سے بہت کچھ بنا لیتے ہیں، یہاں تو بہت کچھ تھا، اصل بات کیا ہے؟“

”میں خود اس لڑکی کی جگہ ہنسائی نہیں چاہتی۔ پھسپھسی خبر سے اچھا ہے کہ اس کا ذکر ہی نہ کیا جائے سر۔ ہاں ممکن ہے بعد میں کوئی اچھی سی کوئی نئی چیز بن جائے۔“ فروانے کہا تو باس چند لمحے سوچتا رہا پھر ایک دم سے بولا

”اوکے، جیسا تم چاہو مس فروا۔“

گویا اس نے بات ہی ختم کر دی۔ فروا واپس پلٹی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے دماغ میں وہ سب گھوم رہا تھا کہ اچانک اسے بابا سائیں کا خیال آیا۔ اس نے فوراً ہی مسز نورین نے نمبر ملا دیئے، وہ اس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد فون اٹھا لیا گیا

”ہیلو فروا، کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ مریض کیسا ہے؟“ اس نے پوچھا

”اچھا ہی ہو گا۔ میں تو آگئی تھی وہاں سے۔“ مسز نورین نے بتایا

”اچھا چلو، اپنے اس بندے کا نمبر دو، جو وہاں موجود ہے، میں اس سے پوچھ لیتی ہوں۔“

اس نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی

”لگتا ہے، تمہیں معلوم نہیں۔ میں اور میرے لوگ کوئی دو گھنٹے بعد ہی واپس آگئے تھے۔“

کیونکہ اس مریض کا والد وہاں آگیا تھا۔ اس نے شکریے کے ساتھ۔۔۔“

”اس کے ساتھ تو کئی سارے لوگ تھے۔ لیکن آج جب آپ آئیں تھیں تو اس سے کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص آیا تھا، غالباً وہ خود کو مریض کا باپ بتا رہا تھا۔ بہت پریشان تھا وہ۔۔۔“ ڈاکٹر مزید کہنا چاہ رہا تھا کہ فروانے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے تیزی سے پوچھا

”سوری سوری ڈاکٹر پلینز، یہاں مجھے یہ بتائے گا کہ وہ یہاں جو دیہانی لوگ تھے، انہوں نے اس بندے کو پہچان لیا تھا، کہ وہ ہی جنید کا والد ہے یا جنید کو ہوش آگیا تھا اور اس نے اپنے باپ کو پہچان لیا تھا؟“

اس پر ڈاکٹر نے کہا

”نہیں مریض کو ہوش نہیں آیا تھا، اسی لئے وہ بندہ پریشان تھا، اس کی میرے خیال میں ان دیہاتی لوگوں سے کافی بحث ہوئی تھی۔ وہ دیہاتی اس مریض کو یہاں سے لے جانے نہیں دے رہے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ دیہاتی اس بندے کو پہچانتے نہیں تھے۔“ فروانے تصدیق کی

”جی، میرے خیال میں ایسا ہی تھا۔“ ڈاکٹر نے محتاط انداز میں بتایا

”تو پھر وہ یہاں سے کیسے گئے؟“ فروانے پوچھا



سے یہاں آج ہی شفٹ ہوا ہے۔ اور اس کا نام جنید ہے۔ یہ سنتے ہی وہ آفس سے باہر نکلی اور اس طرف کار بھگاتی چلی گئی۔

استقبالیہ سے معلوم کر کے وہ سیدھی آئی سی یو میں چلی گئی۔ وہاں جنید ہی تھا۔ وہ اب تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس نے شیشے کی دیوار کے پار ہی اسے پڑے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ متعلقہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے پلٹی ہی تھی کہ اس کے سامنے ایک بردبار اور متحمل مزاج شخصیت والا ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا اسی کی جانب متوجہ تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ ٹھٹک گئی تو اس ادھیڑ عمر شخص نے ذرا آگے بڑھ کر بڑے نرم لہجے میں کہا ”بیٹی، آپ ہی وہ جرنلسٹ ہو جس نے جنید کے لئے کچھ بندوں کو دیکھ بھال کے لئے چھوڑا تھا۔“

”جی میں ہی ہوں۔ اور آپ۔۔۔؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تبھی وہ بولا

”میرا نام عظیم چوہدری ہے اور جنید میرا بیٹا ہے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے بیٹے کا خیال کیا۔ بلاشبہ آپ کا دل بہت اچھا ہے، جس نے محض انسانیت کے ناطے مدد کی۔ بیٹا تم کسی اچھے اور سلجھے گھر کی لگتی ہو۔“ اس نے احسان مندانہ انداز میں کہا تو وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی

”عظیم صاحب۔! کیا ہم تھوڑی دیر کے لئے بات کر سکتے ہیں۔“

”کیوں نہیں، بولو؟“

”یہاں نہیں، باہر لان یا کوریڈور میں پلیز۔“ اس نے عاجزانہ انداز میں کہا تو عظیم چوہدری نے سر ہلایا اور باہر کی جانب قدم بڑھادیئے۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر لان میں آگئے۔ وہاں سنگی بچ پڑے تھے۔ وہ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ فروا کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ بات کا آغاز کہاں سے کرے۔ وہ اس بندے کے بارے بات کرنے جارہی تھی جو موت و حیات کی کشمکش میں تھا۔ تبھی اسے خیال آیا تو اس نے پوچھا

”آپ کو میرے بارے میں کیسے پتہ چلا کہ میں نے جنید کی مدد کی تھی؟“

”آپ نے شاید غور نہیں کیا، میرے ساتھ دو لوگ اور بھی ہیں۔ وہ وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دیہات کے ہیں۔“ اس نے بتایا

”دیکھیں عظیم صاحب! میں روہی سے ہی ہو کر آئی ہوں، وہاں سے مجھے کافی حد تک صورت حال بارے پتہ چلا ہے۔ وہاں پر تو کوئی بھی جنید کے والدین کو نہیں جانتا۔

اور آپ۔۔؟“ اس نے پھر سے سوال چھوڑ دیا، جس پر وہ طویل سانس لیتے ہوئے بولا



”بیٹی! آپ کا تجسس بجا ہے، ہونا بھی چاہیے، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ اس سوال کو یہیں چھوڑ دیں کہ روہی میں جنید کے والدین کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ یہ میرا وعدہ رہا کہ میں پھر کسی وقت تفصیل سے آپ کو اس بارے بتا دوں گا۔ جہاں تک میرے جنید کے والد ہونے کا سوال ہے تو یہ یقین رکھو کہ میں ہی اس کا باپ ہوں۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں اصرار تھا، جیسے وہ پوچھنا چاہ رہی ہو۔ تب وہ ذرا پہلو بدل کر بولا

”میں آج سے تقریباً پچیس برس پہلے لندن چلا گیا تھا۔ اور آج میری عمر پچاس کے لگ بھگ ہے۔ میں نے لندن میں اپنا کاروبار شروع کیا تو چل نکلا۔ اور آج میں مختلف ملکوں کے لوگوں سے بزنس کر رہا ہوں۔ یہاں پاکستان میں، آپ کے اسی شہر میں، میرے بہت سے جاننے والے موجود ہیں۔ یہ سب لوگ گواہی دیں گے کہ جنید میرا بیٹا ہے۔ میرے تمام تر بزنس کا اکلوتا وارث۔ اب اس سے زیادہ میں آپ کو کیسے یقین دلا سکتا ہوں، وہ آپ بتا دیں بیٹی؟“

”چلیں، میں یہ مان لیتی ہوں کہ وہ آپ ہی کا بیٹا ہے لیکن اسے روہی میں اپنا آپ چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ لندن کو چھوڑ کر یہاں کیوں پڑا ہوا تھا، کیا وہ پہلے ہی سے مہر کو جانتا تھا؟ یا پھر اس کا کوئی مقصد تھا؟“ فروانے ایک دم سے کئی سوال کر ڈالے تو عظیم چوہدری کے چہرے پر تکلیف دہ آثار ابھر آئے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر دھیمے لہجے میں تخیل سے بولا



سوچے۔ یہ کیسا جذبہ ہے، کیا واقعتاً یہ کوئی جذبہ ہے یا کچھ اور ہے، کوئی الوہی قوت، پھر اسے احساس ہی نہ رہا۔ وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

فرو تیار ہو چکی تھی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ اسے یہ اچھی طرح احساس تھا کہ اس کی ماما اور پاپا ناشتے پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ یہ اس کا معمول تھا کہ وہ ناشتہ کم از کم اپنے والدین کے ساتھ کرتی تھی۔ وہ تیزی سے ڈرائینگ روم میں آئی۔ حسبِ عادت اس نے اونچی آواز میں اسلام علیکم کہا تو اسی دوران اس کی نگاہ ایک تیسرے فرد پر بھی پڑی، جو اس کی جانب پشت کئے بیٹھا تھا۔ تبھی اس کے پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا

”لو فروا بھی آگئی ہے، اس سے ملو۔ اور فروا یہ میرے بہت اچھے دوست عظیم چوہدری۔“

فروا ایک لمحے کے لئے توساکت ہو کر رہ گئی۔ پھر سلام کرتے ہوئے اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ عظیم چوہدری نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا

”میں اپنی اس بیٹی سے پہلے ہی مل چکا ہوں۔ یہ وہی رپورٹر تو ہے۔ مجھے فخر ہے کہ یہ میرے دوست کی بیٹی ہے۔ تم نے بہت اچھی تربیت کی ہے حسن اس کی۔“

”پاپا، آپ انہیں جانتے ہیں، یہ کب سے آپ کے دوست ہیں؟“ فروانے پوچھا

”تب سے بیٹا، جب ہم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ پھر اسے لندن جانا پڑا۔ ہمارے درمیان

رابطہ تو تھا، لیکن یہ اس دوران یہاں نہیں آیا۔“ اس کے پایا نے بتایا



”کیا آپ ان کے بیٹے جنید سے ملے ہوئے ہیں؟“

”ہاں۔! میں اس سے ملا ہوں اور اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“ یایا نے کہا تو عظیم چوہدری

دھیمے لہجے میں بولا

”آپ کا تجسس بجا ہے بیٹی۔ کیونکہ آپ کے سامنے جو تصویر ہے، وہ مکمل نہیں ہے۔ وہ سوال میں نے جن کے بارے میں کہا تھا کہ اس پر بعد میں بات کریں، اب میں وہ ساری بات آپ کو بتا دوں گا۔ اور دوسری بات بیٹا! جنید کو رات ہوش آ گیا تھا۔ اب وہ خطرے سے باہر ہے۔“

”کرم ہے ربِّ کریم کا۔“ فروا کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو یاپا نے کہا

”فروا، میرا خیال ہے کہ اب ناشتہ کیا جائے۔ ناشتے کے بعد میں تمہارے ذمے ایک کام لگانا چاہ رہا ہوں، اگر تم کرو تو۔“

”پاپا! آپ کیسی بات کر رہے ہیں، آپ کہیں اور میں نہ کروں۔ بولیں کیا بات ہے۔“

پہلے ناشتہ کرو، پھر بتانا ہوں۔“ انہوں نے کہا اور وہ سب ناشتے میں مصروف ہو گئے۔
اندرا تجسس سمندر کی لہروں کی مانند اٹھنے لگا تھا۔

ناشتے کے بعد فروا، عظیم چوہدری اور حسن باہر آکر لان میں بیٹھ گئے۔ تبھی فروا نے پوچھا

”پاپا وہ آپ کا کام؟“



”میں انہیں ہسپتال لے جاؤں گی۔“ وہ جلدی سے بولی تو اس کا پایا چلا گیا۔ تبھی عظیم چوہدری اپنے بالوں میں ہاتھ پھر کر بولا۔

”بیٹی شاید یہ حالات اس طرح کبھی سامنے نہ آتے اگر جنید پاکستان آنے کی ضد نہ کرتا۔“
”وہ کیوں آیا؟“ اس نے پوچھا تو وہ بتاتا چلا گیا

☆....☆....☆

عظیم چوہدری، صحرائے چولستان کے سرے پر آباد شہر بہاول پور میں رہتا تھا۔ اس کا گھرانہ متوسط طبقے سے تھا۔ باپ ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ اسے اپنے بیٹے سے بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ اگرچہ عظیم شروع ہی سے لاابالی تھا۔ گھومنے پھرنے اور سیر سپاٹے کا شوقین تھا، لیکن پڑھنے میں ٹھیک تھا۔ اس کا تعلیمی کیئریر مایوس کن نہیں تھا۔ ان دنوں وہ یونیورسٹی کے دوسرے سال کے آخر میں تھا۔ چند دن بعد وہ سیشن ختم ہو جانے والا تھا۔ اس کے چند دوست تھے جو سبھی ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انہی دنوں اس کے دوستوں کو ہرن کا شکار کرنے کی سوچھی۔ عظیم نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا

”یار اب وہ دن نہیں رہے جب یہاں روہی میں ہرن کا شکار مل جایا کرتا تھا۔ اب تو یہاں ہرن دیکھنے کو نہیں ملتا۔“

”یار یہ جو شہزادے آتے ہیں یہ کہاں شکار کرتے ہیں؟“ اس کے ایک دوست نے کہا

”یاروہ شہزادے ہیں، ان کی اپنی شکار گاہیں ہیں۔“ اس نے سمجھایا

”چل یار اگر ہرن نہ بھی ملا تو کیا ہوا، صحرا ہی دیکھ آئیں گے۔ سنا ہے صحرا کی رات بھی بڑی ماورائی ہوتی ہے، بندے پر جادو کر دیتی ہے۔ یہ حسرت تو نہ رہے گی کہ ہم نے رات کو صحرا نہیں دیکھا۔“ اس کے ایک دوسرے دوست نے صلاح دی۔

”یہ تو ہے، صحرا کی صبح اور شام کا نظارہ ہی دل فریب ہوتا ہے۔ اور رات چاندنی ہو تو وہ واقعتاً جادو کر دیتی ہے۔“ تیسرے دوست نے کہا تو ان کے درمیان طے ہو گیا کہ ایک رات وہاں جا کر دیکھتے ہیں۔ اچھا لگا تو پھر امتحانوں کے بعد کیمپ لگا کر چند راتیں گزاریں گے۔

یونیورسٹی کی جنوبی سمت میں کافی آگے جا کر نہر بہتی تھی۔ جیسے خاصا سرسبز کر کے پارک بنا دیا گیا تھا اور وہ جگہ گرین بیلٹ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں وہاں روزانہ بڑی تعداد میں جاتے تھے۔ اسی نہر سے آگے جنوب کی جانب صحرا چولستان شروع ہو جاتا تھا۔ جو آگے میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک شام وہ چاروں فور وہیل جیپ پر، بہت پر جوش اور خوش کن انداز میں صحرا کی طرف نکل گئے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان اور اپنی حفاظت کے لئے اسلحہ بھی تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ہرن تو انہیں کیا ملنا تھا۔ ویسے ہی ادھر ادھر پھرتے رہے۔ انہیں چاندنی میں صحرا جادوئی لگ رہا تھا۔

وہ ایک کھلی سی جگہ تھی اور اس کے چاروں طرف ٹیلے تھے، جہاں انہوں نے جا کر ڈیر لگایا۔ جیپ کی ہید لائٹس میں انہوں نے کھانے پینے کا سامان نکالا اور گپ شپ، ہنسی مذاق کے ساتھ کھانے پینے لگے۔ ہر طرف سنائے کا وہ بالکل منفرد تجربہ تھا۔ آدھی رات کے وقت، اچانک انہیں اپنی مشرقی جانب سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ انہیں تجسس ہوا کہ یہ کیا ہوا ہے؟ وہ اٹھ کر ادھر دیکھنے لگے۔ بہت دور انہیں ہیولوں کی مانند اونٹ دکھائی دیئے جو بھاگتے چلے آ رہے تھے۔

”یہ کیا ہو سکتا ہے یار؟“ ان میں سے ایک دوست نے ایک دم سے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا

”ممکن ہے یہ صحرائی ڈاکو ہوں۔“ ایک دوسرے نے تیزی سے کہا تو باقی بھی خوف زدہ ہو گئے

”نہیں یار یہ کیسے ممکن ہے؟“ اس نے کہا

”وہ اگر نہ بھی ہوں تو ان کے پاس اسلحہ ہے، وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ تیسرا بولا

”یار اسلحہ تو ہمارے پاس بھی ہے۔“

”مگر ہم ان کی طرح نہیں ہیں۔ جلدی سے اپنا سامان سمیٹنا شروع کرو۔“ ایک نے صلاح دی تو وہ سامان سمیٹ کر بھاگنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہی لمحات میں ایک اونٹ ان کے بہت

قریب آگیا تھا۔ وہ سارے اپنی جیب میں بیٹھ چکے تھے۔ جس وقت وہ گئیں لگا کر جانے لگے تو اونٹ پر سے کسی مرد نے چلا کر کہا

”ٹھہرو، ٹھہرو خدا کے لئے ٹھہرو، ہماری جان بچاؤ،“

اس کے یوں کہنے پر جیپ کو بریک لگائے تو کسی نے کہا

”اونکلو نکلو۔! یہ کہیں ان کا ڈھونگ ہی نہ ہو۔“

جبکہ اونٹ والا مسلسل چلا رہا تھا۔ تبھی ایک نے کہا

”چھوڑ یاد ایسی بھی کیا بزدلی، تو گن نکال، میں دیکھتا ہوں۔“

چپ رُک گئی۔ وہ بہت قریب آگئے تھے۔ تبھی انہوں نے دیکھا، اونٹ پر دو لوگ تھے، مرد کے پیچھے عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مسلسل چلا رہا تھا۔ تبھی وہ ان کے قریب آگئے۔ اونٹ بٹھانے سے پہلے ہی وہ مرد اونٹ کے ساتھ گھسٹتا ہوا اتر اور ان کے قریب آگیا۔ انہوں نے دیکھا وہ اجنبی شدید زخمی تھا۔

”کیا ہوا تمہیں؟“ عظیم نے پوچھا

”میرے فائر لگ گیا ہے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا

”کس نے مارا اور کیوں؟“ عظیم نے تیزی سے پوچھا

”یہ ان سوالوں کا وقت نہیں ہے۔ خدا کے لئے۔۔۔“



”آؤ، آؤ۔۔۔ تجھے ہسپتال لے چلیں، آؤ جلدی۔“ عظیم نے کہا تو وہ اجنبی کراہتے ہوئے

بولا

”نہیں، مجھے پتہ ہے کہ میں بچ نہیں پاؤں گا، لیکن اگر تم ایک زندگی بچالو۔“ اس نے دور آتے ہوئے اونٹوں کو دیکھا

”کس کی زندگی؟“ ایک دوست نے پوچھا

”یہ میرے ساتھ، میری ہونے والی بیوی ہے، ہم بھاگ کر آرہے ہیں، ہمارے پیچھے لگے بندے ہمیں مارنا چاہتے ہیں، خدا کے لئے اسے لے کر نکل جاؤ۔“ اس نے بہ مشکل کہا اور چکر اکر زمیں پر گر گیا۔ اس وقت تک وہ لڑکی اونٹ کو بٹھا کر اتر چکی تھی۔ وہ بھاگ کر اس مرد کے پاس آئی۔

”نہیں، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے؟“ وہ دھاڑ مار کر بولی

”جاؤ، ان کے ساتھ چلی جاؤ، تمہاری زندگی بچ جائے گی، ورنہ وہ تمہیں ابھی مار دیں گے۔ جاؤ۔۔۔“ اس نے زور لگا کر کہا اور بے ہوش ہو گیا۔ عظیم نے جلدی سے پانی کی بوتل نکالی اور اس کے منہ میں پانی ڈالا، اسے ہوش آیا تو کہنے لگا، ”جاؤ، جلدی چلے جاؤ۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے بوتل عظیم سے چھین لی۔ تبھی نجانے اس کے دوست کو کیا سوچھا، اس نے گن سے فائر نکال دیئے۔ لڑکی زار و قطار رو رہی تھی۔ اجنبی سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس

نے اسے جیب میں بیٹھے کے لئے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اور پھر ایک دم سے اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ لوگ ان سے تھوڑی دور آکر رُک گئے تھے۔ کچھ دیر بعد سامنے سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ وہ لڑکی بلکتے ہوئے ان کے ساتھ جیب میں آ بیٹھی اور انہوں نے جیب بھگالی۔ صحرا بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ گرین بیلٹ بھی پار کر آئے تھے۔ تھوڑا سکون ہوا تو ان کے سامنے یہ سوال تن گیا کہ اس لڑکی کا کیا کریں۔ وہ سبھی جیب سے اتر کر مشورہ کر کے اس سوال کا جواب تلاش کرنے لگے۔

”یار ہم اسے اپنے ساتھ ہو سٹل میں تو نہیں رکھ سکتے، اور اس وقت کسی لڑکی کی منت بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کم از کم اسے ایک رات ہی اپنے ساتھ رکھ لے۔“

”تو پھر کیا کریں؟“ اس نے پوچھا

”ظاہر ہے، تو اسے ساتھ اپنے گھر لے جا، پھر دیکھتے ہیں۔“ دوست نے مشورہ دیا

”نہیں میں اسے ابھی گھر لے گیا تو اس کے ساتھ ہی گھر سے نکال دیا جاؤں گا، کچھ اور سوچ؟“

”یہ تو کرنا پڑے گا۔ وہاں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ گھر والوں کو سچ بتادیں گے، ہم بھی چلتے ہیں تیرے ساتھ۔ اگر وہ نہ رکھیں گے، تو میں ایک دو دن میں اسے اپنے گاؤں لے جا کر چھوڑ دوں گا۔“



یہ طے کر کے وہ سیدھے عظیم کے گھر چلے گئے۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ دروازہ اس کے ابو نے کھولا۔ ان کے ساتھ ایک چولستانی لباس میں کھڑی لڑکی کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے تحمل سے ان سب کی بات سنی۔ تب تک عظیم کی ماں بھی وہیں آگئی تھی۔ اس نے بھی ساری کہانی سن لی تھی۔ جب وہ کہہ چکے تو عظیم کے والد نے اس لڑکی کو اپنی بیوی کے ساتھ اندر بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے سوچتے ہوئے کہا

”تم لوگوں نے اسے اپنے ساتھ لا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔“

”وہ کیسے انکل، صبح ہم اسے کسی بھی تھانے میں۔۔۔“ ایک دوست نے کہنا چاہا تو اس کے والد نے بات کاٹتے ہوئے کہا

”نہیں بیٹا، اب یہ اتنا آسان نہیں ہے، کنوئیں میں گری اینٹ کبھی سوکھی باہر نہیں آتی۔ وہ لوگ دشمن ہی تو تھے جنہوں نے اس لڑکی کے ساتھی کو مارا ہے، وہ قتل کا مقدمہ تم لوگوں پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جائیں گے۔ وہ مقتول اب زندہ ہو کر تمہاری گواہی تو نہیں دے سکے گا۔ اور تھانے والے خواہ مخواہ ذلیل کریں گے، چاہے یہ لڑکی تم لوگوں کے حق میں گواہی بھی دے دے۔ اور پھر عورت کا کیا اعتبار، وہ اپنوں کو بچانے کے لئے، قتل تم لوگوں پر ڈال دیں۔“

”اسے باہر لاؤ۔“

ماں اندر سے پیروزاں کو باہر لے آئی۔ وہ آکر بیٹھ گئی تو ابو نے عظیم کو سمجھاتے ہوئے کہا ”دیکھو بیٹا! یہ جن لوگوں کی بیٹی ہے، وہ بہت خطرناک لوگ ہیں، روہی کے یہ لوگ خاصے اثر و رسوخ والے بھی ہیں۔ یہاں تمہاری بہنیں بھی ہیں اور تیرا چھوٹا بھائی بھی، میں نہیں چاہتا کہ ان پر کوئی اثر پڑے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابو، وہ اثر والے ہیں تو کیا ہوا، اس لڑکی کو انہیں واپس کر دیتے ہیں، ہمیں اس سے کیا۔“ عظیم نے لاپرواہی سے کہا

”اب یہ اتنا آسان نہیں ہے بیٹا۔ وہ جو قتل ہوا ہے وہ کس کے کھاتے میں جائے گا۔ میں نے پتہ کر لیا ہے، لاش تھانے میں پڑی ہے۔ اور ان لوگوں نے بڑے سکون کے ساتھ قتل کا مدعا ان لڑکوں پر ڈال دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ لڑکی کے اغوا کا پرچہ بھی ہو گیا ہے۔ پولیس اس جگہ سے ہو آئی ہے۔ جہاں رات تم لوگ تھے۔“ ابو نے منتشر لہجے میں کہا

”ہائے ربا۔! یہ بیٹھے بیٹھائے کیا ہو گیا۔ اب کیا ہو گا؟“ ماں نے روہانسا ہوتے ہوئے پوچھا ”تم سب کو پتہ ہے کہ میں ان سے لڑ نہیں سکتا۔ اگر لڑوں گا تو مجھے اپنی ساری توانائی اسی دشمنی پر لگانا پڑے گی۔ نوکری بھی ہاتھ سے جائے گی اور میرے دوسرے بچے بھی ہیں، وہ سب ڈسٹرب ہو جائیں گے۔“ ابو نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا



ہوتے ہی وہ شہر چھوڑ گئے۔ پھر! پیروزاں قصہء پارینہ بن گئی۔ انہوں نے اسے تلاش نہیں کیا۔ انہوں نے تو یہ تک معلوم نہیں کیا کہ وہ ہے کہاں؟ عظیم چاہتا تھا کہ وہ پیروزاں کو تلاش کرے لیکن اس کے باپ نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ عظیم دل برداشتہ ہو گیا۔ اس نے جنید کو اپنی ماں کے پاس چھوڑا اور لندن چلا گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ وہ لندن میں پہلے تو ہر طرح کی نوکری کرتا رہا، پھر اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کیا، جو چل نکلا۔ جنید اس وقت پانچ سال کا تھا جب اس نے اسے وہاں بلوالیا۔ پھر وہ دونوں باپ بیٹا مل کر پاکستان نہیں آئے۔ جنید وہاں پڑھا اور جوان ہوا۔ ایک دن اس نے کہا ”پاپا! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”بولو، کیا بات ہے؟“

”پاپا میں پاکستان جانا چاہتا ہوں، اپنی ماں کے پاس۔ اسے لانے کے لئے۔“ جنید نے دھیمے سے انداز میں کہا تو وہ ششدر رہ گیا۔

”تم جانتے ہو وہ کہاں ہے، زندہ ہے؟“

”ہاں پاپا، وہ زندہ ہے، اور میں جانتا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔“ اس نے سکون سے کہا ”تم نے۔۔۔ یہ سب کیسے؟“ حیرت کے باعث اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

انکل نے مسکرا کر جانے کا اشارہ کیا تو باہر کی جانب چکی گئی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گئی اور چند تمہیدی باتوں کے بعد جنید کے بارے میں پوچھا

”میں ابھی ذرا دیر پہلے اس کے پاس سے ہو کر آیا ہوں۔ اسے آج روم میں شفٹ کر دیں گے۔ وہاں اس کا علاج ہونا شروع ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر نے بتایا

”آپ کے خیال میں اسے بالکل ٹھیک ہونے میں کتنے دن لگ جائیں گے۔“ اس نے سوچتے ہوئے پوچھا

”اس کے زخم بھرنے میں کم از کم دو ہفتے تو لگ ہی جائیں گے، لیکن آپ مریض کو دو تین دن بعد گھر لے جاسکتے ہیں ہمارے پاس ایسا انتظام ہے کہ فون کال پر مریض کو دیکھ سکتے ہیں۔“

”تھینک یو ڈاکٹر۔“ فروانے ممنونیت سے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ آئی۔ دوپہر تک اسے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ جو بھی چیز چاہئے تھی، فروانے فون کال پر منگوا لی۔ خطرہ ٹل جانے سے وہ سکون محسوس کر رہے تھے۔ فروا کچھ دیر کے لئے چینل جانا چاہتی تھی۔ انکل نے بھی اسے جانے کی اجازت دے دی۔

”تم سکون سے چائے پیو، میں بتاتی ہوں۔“ اس نے چائے کا سپ لیا اور اختصار سے ساری بات بتادی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا، جب وہ کہہ چکی تو جنید بولا

”یہ بابا سائیں نے اچھا کیا کہ مہر و کو گھر بھیج دیا ہے، مگر اس پر خطرہ تو اب منڈلائے گا، وہ اسے مار دیں گے۔“

”ممکن ہے،“ فروانے چوتکتے ہوئے کہا پھر لمحہ بھر خاموش رہ کر بولی، ”پہلے مجھے احساس نہیں تھا کہ وہ اس قدر خطرناک لوگ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن آج انکل کی بات سن کے مجھے اب احساس ہوا ہے۔“

”مجھے وہاں پر ہونا چاہیے فروا۔“ وہ اکیدم سے بے چین ہو گئیں۔

”اپنی حالت دیکھی ہے تم نے؟“ فروانے حیرت زدہ انداز میں کہا

”تو پھر کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے بولا

”کیا تمہیں مہر و سے اتنی محبت ہے۔“ فروانے پوچھا

”مجھے اس سے محبت ہے یا نہیں، لیکن اپنی ماں تک پہنچنے کا وہ میرا ایک راستہ تھی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا تو جنید کہتا چلا گیا۔

”دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی اپنی ماں بہت شدت سے یاد آتی تھی۔ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ میری ماں ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔ بچپن کی کچھ یادیں بھی ان کی اس بات کی تائید کرتی

”تمہارے پاپا کو وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں، وہ اس قتل سے بھی واقف تھے جس کی وجہ سے میرے پاپا میری ماں کے ساتھ ملے تھے۔ ان سے درخواست کی گئی کہ ہم پولیس یا کسی بھی فورسز کو درمیان میں نہیں لانا چاہتے، ہو سکتا ہے کوئی پرانا کھاتہ کھل جائے۔ یہاں دربار پر رہ کر کوئی ایسا موقع تلاش کیا جائے جس سے میری ماں کو ہمارے زندہ ہونے کا ثبوت مل جائے۔“

”تو پھر کیا کوئی موقع نہیں ملا؟“ فروا نے پوچھا

”میں نے سوچا کہ جب میں یہاں آہی گیا ہوں تو بہت صبر اور تحمل سے سارے ماحول کو دیکھوں، ان سب کو، ایک ایک فرد کو جانوں، انہیں پرکھوں، پھر اس کے بعد کوئی قدم اٹھاؤں۔ میں اس میں کامیاب رہا تھا۔ میں نے اپنے ماما اور اس کے خاندان کو جانا، ان کے بارے میں پوری معلومات لیں۔ وہ سامنے سے جتنے سادہ، شریف اور ملنسار دکھائی دیتے ہیں، وہ ویسے نہیں ہیں۔ وہ بہت ظالم ہیں۔“ جنید نے انتہائی دکھ سے کہا

”کیا ظلم دیکھا تو ان کا۔“ اس نے تیزی سے پوچھا

”فروا! تم یہاں رہتی ہو، تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں قبیلہ سسٹم ہے۔ اور یہ قبیلہ سسٹم جہاں بھی ہوتا ہے، وہاں ان کا اپنا قانون اور اپنی سزا جزا ہوتی ہے۔“ جنید نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”دوا بھی لی ہے، کھایا بھی ہے، لیکن ویسا نہیں جیسے تم کھلاتی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ تو فروا کو لگا جیسے آگ اس کے بدن کو چھو گئی ہے۔ یہ کیسی آگ تھی، جس نے اسے پورے وجود سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس سے وہاں کھڑا ہی نہیں ہوا گیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی، اور پھر کتنی دیر تک یہی سوچتی رہی کہ یہ کیا ہو گیا۔ تب اس پر انکشاف ہو گیا کہ وہ جنید سے محبت کرنے لگی ہے۔ ایسا کب اور کس ہو گیا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا، شاید وہ لاشعوری طور پر اس کے نزدیک ہوتی چلی گئی تھی۔ اس نے اپنے حواسوں پر قابو پایا اور جنید کے پاس چلی گئی اور پھر رات گئے تک وہ اس سے باتیں کرتی، جب وہ سویا تو وہی وہاں سے اٹھ کر آئی۔ اسی رات اس کے سپنے رنگین ہو گئے اور وہ ایک انجانی دنیا میں جا پہنچی۔ اور پھر یہ سپنے رنگین سے رنگین تر ہوتے چلے گئے اور وہ اپنی دنیا میں کھو گئی تھی۔

☆....☆....☆

اس دن صبح کا سورج چمک رہا تھا۔ فروا تیار ہو کر پورچ میں آئی۔ ڈرائیور کار کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ اسے اشارہ کر کے پچھلی نشست پر بیٹھنے لگی تو ڈرائیور نے مودب انداز میں کہا ”بی بی جی، صاحب نے کہا ہے کہ کہیں بھی جانے سے پہلے ان سے مل کر جائیں۔“

”کب کہا تھا۔“ فروا نے پوچھا

”جو بھی ہو، مجھے کون روک سکتا ہے اپنے بیٹے کے ساتھ ملنے سے۔۔۔“ اس نے غصے میں

کہا

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے شوہر عظیم چودھری بھی یہیں ہیں؟“

”کیا؟ وہ۔۔۔ وہ بھی۔۔۔؟“ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ شدت حیرت سے وہ گنگ ہو گئی اور

ہو نقوں کی طرح اسے دیکھنے لگی۔ وہ کتنے ہی لمبے یونہی ساکت رہی۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا

ہو۔ پھر جیسے اسے ہوش آگیا، اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فروانے اسے رونے دیا،

نجانے کب کے رکے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ تبھی وہ یکنخت بولی،

میرے اپنوں نے یہ بھی ظلم کیا مجھ پر۔۔۔“

”کیسا ظلم، یہی کہ آپ کے شوہر اس دنیا میں نہیں رہے۔“ فروانے پوچھا

”ہاں۔! یہی کہا میرے بھائی نے مجھے۔ اور میں نے مان لیا۔“

”کیوں مان لیا تھا۔“ اس نے زور دے کر پوچھا

”حالات ہی ایسے تھے۔“ وہ ماضی میں ڈوبتے ہوئے بولی

”کیسے تھے حالات، یہ سب کیسے ہوا؟“ فروانے پوچھا تو وہ دھیرے دھیرے بتانے لگی۔

☆....☆....☆

ایک بیٹا پیدا ہوا۔ وہ اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن تھی۔ لیکن شاید قسمت کو ایسا منظور نہیں تھا۔ ایک شام وہ شاپنگ کے لئے بازار میں تھے کہ اسے اغوا کر لیا گیا۔ اُسے یوں بے دردی سے گاڑی میں پھینکا گیا تھا کہ وہ ہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ لوگ کب اسے بستی میں لے آئے ہیں۔ اسے جب ہوش آیا تو وہ اپنے باپ کے گھر کے ایک کمرے میں فرش پر پڑی تھی۔ وہ ساری رات اسی کمرے میں بھوک پیاسی بیٹھی رہی۔ کوئی اُسے پوچھنے تک نہیں آیا۔

اگلی صبح جو اسے پہلا چہرہ دکھائی دیا، وہ اس کی ماں کا تھا۔ وہ دونوں چند لمحے تو ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں، پھر ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگیں۔ وہ بہت ساری باتیں اس سے کرنا چاہتی تھی لیکن کر نہیں پائی۔ ماں کو خوف ہی لگا رہا کہ کہیں اس کا شوہر نہ آجائے۔ وہ اسے ویسے ہی کمرے میں چھوڑ کر پلٹ گئی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کے باپ اور بھائی کے ساتھ اس کے منگیتر کا باپ بھی اسی کمرے میں آگئے۔ اس کے باپ نے کھڑے کھڑے ہی کہا

”پیر وزاں۔! تم نے میری عزت گنوا کر اچھا نہیں کیا۔ پوری روہی میں ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا ہے۔ پر جند وڈا کہ موت سے تھوڑا ازالہ ہو گیا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر کہتا ہی چلا گیا، ”تیرے بھائی خدا بخش کی شادی تیرے منگیتر کی بہن سے ہو گئی ہے، اس

کا اظہار کرے یا اپنی قسمت پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ بابا سائیں سے سن لینے کے بعد اب یقین نہ کرنے کی کنجائش رہی ہی نہ تھی۔

”بابا سائیں میرا پتر۔!“ برسوں بعد جب اس کے لبوں پر پتر کا لفظ آیا تو ماما اندر تک ٹھنڈک سے بھیگ گئی۔

”تیرے بیٹے اور شوہر کو کسی نے نہیں مارا تھا۔ ہاں مگر خدا بخش وغیرہ ایسا چاہتے تھے کہ اگر پیروزاں نہ مانی تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن بعد میں تو نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور نہ ہی وہ اس شہر میں ملے، اسلئے خاموشی چھا گئی۔ تیرے منگیتر نے بھی اس لئے تم سے شادی نہیں کی کہ نکاح پر نکاح نہیں ہو سکتا تھا۔“

”تو اس کا مطلب ہے جنید میرا بیٹا ہے؟“ پیروزاں نے بھابھی سے پوچھا

”ہاں۔! اب یہ بات واضح ہو گئی ہے۔ جاؤ، یہ تو تجھے خوشیاں نہیں دے سکے، تو اپنے بیٹے کو ہی خوشیاں دے دے۔“ بابا سائیں نے اسے سمجھایا تو وہ اس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ انہیں تلاش کہاں کرے۔

”بابا سائیں۔! میرے ساتھ چلو، مجھے بتاؤ میرا پتر کہاں ہے؟“ پیروزاں بے تاب ہو گئی۔ تبھی اس نے ہی اسے فروا کے پاس جانے کو کہا اور اس کے ساتھ ایک بندہ بھیج دیا۔ وہ سیدھی چینل آگئی۔

”ماں صدقے پتر۔۔۔“ پیروزاں تڑپ کر آگے بڑھی اور اسے سنبھالتے ہوئے، گلے سے لگالیا پھر جو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ جنید بھی رُورہا تھا۔ جب کچھ دیر بعد یہ طوفان تھا تو پیروزاں اس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی ”تو نے مجھے آتے ہی کیوں نہیں بتا دیا کہ تم میرے پتر ہو، تجھے دیکھ کر دل تو دھڑکتا تھا، مگر کیا کرتی، میرے اپنوں ہی نے مجھے دھوکا دیا میرے بیٹے۔“ پیروزاں انتہائی جذباتی انداز میں کہہ ہی تھی۔ تبھی جنید نے کہا

”جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا ماں، اب بس آپ نے کہیں نہیں جانا، میرے پاس رہنا۔“

”میں تیرے پاس رہنے ہی کو تو آئی ہوں میرے بیٹے۔ اب ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔“

اس نے روتے ہوئے کہا تو جنید اسے دلا سے دینے لگا۔ فروا آگے بڑھی اور پیروزاں کو ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر نرس کو باہر آنے کا اشارہ کر کے وہ اپنی ماما کے ساتھ کمرے سے چلی گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ ماں اور بیٹا کھل کر باتیں کر لیں۔

وہ اک الو ہی شام تھی۔ فضا میں ایسی خوشی کا تاثر تھا، جیسے کسی کے زخموں پر مسکراہٹ کا پھابا رکھا جا چکا ہو۔ جنید، پیروزاں اور عظیم چوہدری کئی برسوں کے بعد پھر سے مل گئے تھے۔ وہ جنید ہی کے کمرے میں تھے۔ فروا اور اس کے ماما پاپا بھی وہیں چلے گئے۔ پھر باتوں کا سلسلہ تھا

کہ دراز ہوتا چلا گیا۔ اک سکون ان کی زندگی میں اتر آیا تھا۔ لیکن جنید کو پوری طرح سکون نہیں تھا، اسے مہر و شدت سے یاد آرہی تھی، جس کا وہ اظہار نہیں کر رہا تھا۔

☆....☆....☆

پیر وزاں کو روہی سے آئے ہوئے ہفتہ گزر چکا تھا۔ وہ جنید کی دیکھ بھال میں ہی الجھی ہوئی تھی، اسی لئے زیادہ ادھر ادھر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا اسے دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ عظیم چوہدری اب واپس لندن جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ پیر وزاں اور جنید کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا چلا جائے۔ فرواب معمول کے مطابق اپنے چینل جانے لگی تھی۔ ماحول میں ایک طرح کی خاموشی آگئی تھی۔

اس دن فروا اپنے آفس میں تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون رسیو کیا تو دوسری طرف سے کسی اجنبی کی آوازیں پوچھا گیا۔

کیا تم فروا ہی ہو؟“

”جی، آپ کون؟“ اس نے پوچھا

”میں خدا بخش بات کر رہا ہوں۔ پیر وزاں کا بھائی اور مہر و کا باپ۔ پہچان گئی ہونا کہ میں کون

ہوں؟“

”ہم یہاں بیٹھ کر صرف سوچ سکتے ہیں، خدا بخش کے من یہیں کیا ہے، وہ ہمیں نہیں معلوم، میں صرف ایک بات جانتی ہوں، مہر و میرے جنید سے بہت محبت کرتی ہے۔ ہم اس کی طرف سے آنکھیں نہیں پھیر سکتے۔ اتنے خود غرض نہیں ہو سکتے۔“ اس کے لہجے میں درد مندی کے ساتھ ایک التجا بھی تھی۔ تبھی پاپا نے تیزی سے کہا

”تو پھر کیا کریں۔ میں نہیں کہتا کہ مہر و کو چھوڑ دیا جائے، اس بے چاری کا کیا تصور، لیکن تم وہاں چلی گئیں تو معاملہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، ایک بار تو انہوں نے تمہیں معاف کر دیا پیر و زاء، اس بار شاید۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے پاپا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ تو ان کے درمیان ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

”یار سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کریں۔ نہ قانون کا سہارا لے سکتے ہیں اور نہ ان سے دشمنی مول لے سکتے ہیں۔“ عظیم چوہدری نے کہا تو پاپا نے گہری سنجیدگی سے کہا

”تم فکر نہ کرو، میں اس شہر میں بیٹھا اتنا کمزور نہیں ہوں کہ خدا بخش جیسے شخص کا مقابلہ نہ کر سکوں، اگر ایسا ہوتا تو اب تک لٹ گیا ہوتا۔ اب تم لوگ سکون سے رہو، میں دیکھتا ہوں کیا کرنا ہے۔“

”کیا کرو گے تم؟“ عظیم نے تیزی سے پوچھا

”میں وقت آنے پر بتا دوں گا۔“ پاپا نے سکون سے کہا اور اٹھ گیا۔

تھی، جس میں وہ حتمی بات کرنا چاہتے تھے۔ تبھی بابا سائیں نے سر اٹھایا اور اپنے سامنے بیٹھے روہی کے سر کردہ بندوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا

”بھائیو! آپ سب جانتے ہیں کہ یہاں ایک گھمبیر مسئلہ پیدا ہو گیا ہوا ہے۔ ہمیں اس مسئلے کو حل کرنا ہے، اسے الجھانا نہیں، مجھے پورا یقین ہے کہ یہ دونوں طرف سے آئے ہوئے لوگ بھی مسئلہ الجھانا نہیں چاہتے، ہم لوگ ان کی بات سنیں اور کوئی فیصلہ کر دیں۔ آپ میں سے تین لوگ چن لیں، مجھے یقین ہے ان بندوں کے فیصلے پر سب ہی آمین کہہ دیں گے۔“

ان کے یوں کہنے پر روہی کے تین سر کردہ افراد کو چن لیا گیا کہ یہ لوگ فیصلہ کریں گے۔ پھر دونوں طرف سے باتیں چلتی رہیں۔ وہی سارے واقعات دہرائے گئے۔ وہاں کوئی بندہ جھوٹ نہیں بول پایا کیونکہ ان واقعات کو سبھی جانتے تھے۔ ساری بات سن لینے کے بعد ثالث میں سے ایک بندے نے کہا

”پہلی بات پیروزاں کی ہے، وہ اپنے گھر چلی گئی، اور وہ اپنی مرضی سے گئی، اس پر زور زبردستی نہیں کی گئی۔ جندوڈا کا قتل جس نے بھی کیا، وہ اب ماضی کا حصہ بن گیا۔ میرا خیال ہے کہ اب نفرت کو بھلا دیا جائے اور اسے اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ رہنے دیا جائے۔ اس کے عوض وہ اپنے جائیداد کے حق کو چھوڑ دیتی ہے، کیا یہ فیصلہ خدا بخش تمہیں منظور ہے؟“

کہا کہ عظیم اور بچہ مرچکے ہیں۔ پھر اس نے خود شادی کی ہے عظیم کے ساتھ۔ اب بھی وہ خود گئی ہے، اسے کوئی یہاں سے لے کر نہیں گیا۔ اس لئے یہ بھی روایت ہے کہ جو بھاگ جائے تو اسے قتل کر دیا پھر اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کا وہ نہیں مانگتے۔ تم نے پیروزاں کا قتل نہیں کیا، اب اگر تم کوئی بات کرو تو قصور وار تم ہو۔ خدا لگتی تو یہی ہے۔“ دوسرے ثالث کی بات ختم ہوتے ہی وہاں پر موجود ہر بندے کے چہرے پر یہ امید بر آئی کہ یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ خدا بخش کچھ دیر سوچتا رہا پھر سر اٹھا کر بولا

”ٹھیک ہے میں آپ کی بات مان لیتا ہوں، پیروزاں کے وٹے کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ اپنے گھر چلی گئی۔ لیکن یہ جو انہوں نے میری بیٹی مہرو کی عزت خراب کی ہے۔ اسے پورے علاقے میں مشہور کر دیا۔ اسے اس حد تک پاگل بنا دیا کہ وہ احتجاج پر آرائی۔ کیا اس کا کسی کو احساس نہیں ہے؟“

اس کی بات سن کر دوسرے ثالث نے تحمل سے کہا

”ہے کیوں نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی تو تم نے ہی رکاوٹ ڈالی، جنید اسے بھگا کر نہیں لے کر گیا تھا۔ بابا سائیں نے رشتہ مانگا تھا۔ بارات گئی تھی۔ اگر ایک دلہن، اپنے دلہا کے لئے احتجاج کرتی ہے تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔“

لوگ سامنے آگئے۔ اس وقت یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب میرا مطالبہ یہ ہے، میری بیٹی کو جان بوجھ کر کیوں ورغلا یا گیا؟ اسے اس حد تک کیوں پاگل کیا گیا کہ وہ بھاگ کر شادی بھی کر سکتی تھی، جانتے بوجھتے ہوئے مجھے اس لڑکے کے بارے نہیں بتایا گیا، کیوں؟“ خدا بخش نے شدت جذبات سے کہا اور پنچائیت کے سب حاضرین کی طرف یوں دیکھا، جیسے ان سے جو بمانگ رہا ہو۔ خدا بخش کے اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ خاموشی پھر سے چھا گئی۔ تبھی بابا سائیں اٹھے اور سب حاضرین کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بولے

”یہ میری غلطی ہے اور میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ اس کی جو سزا ہو مجھے دی جائے اور میں وہ سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں، جبکہ میری نیت ٹھیک تھی، جس کے بارے آپ سب کو بھی معلوم ہے۔“

اس کے یوں کہنے پر پاپا نے بابا سائیں کا ہاتھ پکڑا اور نہایت درد مندی سے کہا

”نہیں باباجی آپ کیوں سزا بھگتے گے۔ ہم جو ہیں۔ خدا بخش ہم تمہارے ساتھ صلح کے لئے آئے ہیں، ہم خون خرابہ نہیں چاہتے۔ پنچایت سامنے ہے جو فیصلہ دے۔“ یہ کہہ کر وہ بابا سائیں کو لے کر بیٹھ گیا۔ تو پہلے ثالث نے پوچھا

”بولو خدا بخش کیا چاہتے ہو، یا ان کے لئے معافی ہے۔“

”میں اب تک خاموش تھا، لیکن تم حد سے بڑھ رہے ہو، تم نے اس لڑکی کا نام لیا ہی کیوں۔۔۔“

”میری بیٹی کا نام لینے والے تم لوگ کون ہوتے ہو، اب کیوں خون جوش مار رہا ہے؟ دوسرے کی بیٹی، بیٹی نہیں ہوتی۔ جاؤ بھری پنچائت کے سامنے میرا یہی مطالبہ ہے۔ یا پھر مجھے جھٹلا دو یا پھر مجھے میرا حق دو۔“ خدا بخش نے انتہائی غصے میں کہا تو خاموشی طاری ہو گئی، کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ تلخ لمحے گزرے تو ثالثوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اب تک خاموش ثالث نے کہا

”خدا لگتی تو یہی ہے کہ خدا بخش سچا ہے۔ اگر یہ لوگ پیروڑاں کی معافی چاہتے ہیں تو اس کا مطالبہ ماننا ہوگا۔ مہر و کو بیاہ کر لے جانا ہوگا اور اس کے عوض وٹہ دینا ہوگا۔ ہمارا فیصلہ یہی ہے۔“ تیسرے ثالث نے کہا تو باقی دو نے بھی اس کے فیصلے کو مانتے ہوئے توثیق کر دی۔ پنچائت نے اپنا فیصلہ دے دیا تھا۔ سب کی نگاہیں عظیم پر جم گئیں تھیں۔ پاپا کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کریں۔ تبھی ایک ثالث نے کہا

”ہمارا فیصلہ مانتے ہو یا نہیں؟“

”میں مانتا ہوں۔“ خدا بخش نے کہا تو انہوں نے عظیم چوہدری کی طرف دیکھ کر پوچھا

”اور تم لوگ؟“

”میں نے اسے نہیں کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ اور پھر میری ماں پر ایسی کئی محبتیں قربان کر سکتا ہوں۔“ جنید نے کہا تو بیروزاں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور بولی

”جنید! اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا تجھے اس سے محبت نہیں ہے؟“

”اگر ہوگی بھی تو میں اپنی ماں کے عوض یہ سودا کبھی قبول نہیں کروں گا۔“ جنید نے واضح انداز میں کہا

’تو پھر کیا کریں جنید؟‘ عظیم چوہدری نے حتمی لہجے میں پوچھا تو وہ بولا

”اماں سے پوچھ لیں۔ وہ کیا چاہتی ہیں۔ یہیں سے ہمارے ساتھ لندن جانا چاہتی ہیں یا پھر وہ مہر و کو لینا چاہتی ہیں، فیصلہ ان پر ہے؟“

بیروزاں ایک دم سے چکر اگئی۔ اس کے بیٹے نے اسے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔ سبھی کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئیں تھیں۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ اس کے سامنے ترازو کے دونوں پلڑے تھے۔ ایک طرف مہر و تھی۔ مہر و کے دل میں جو محبت کی شدت جنید کے بارے میں تھی، وہ نہ صرف اسے معلوم تھی بلکہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ ساری زندگی کا پچھتاوا نہیں لے جاسکتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے بیٹے کا دل مہر و میں ہے۔ وہ ساری زندگی کی کسک اسے بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔ تبھی اس نے ایک دم سے فیصلہ کرتے ہوئے کہا

”بابا آپ پھوپھی اور جنید کو کچھ نہیں کہیں گے۔ آپ کی ضد میں ہوں نا، میں ہی انہیں جا کر انکار کر دیتی ہوں۔ یا آپ کہیں تو یہیں ماس دنیا میں ہی نہیں رہتی۔ ماریں مجھے یا میں خود ہر کھا لیتی ہوں۔“ مہرونے دلد وز انداز میں کہا تو خدا بخش نفرت سے بولا

”یہ تو ہونا ہی ہے۔ اگر تو خود مر جائے تو میں سر خرو نہ ہو جاؤں۔“

یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چلا گیا، جہاں اس کی برادری کے لوگ اکھٹے ہو رہے تھے۔ دوپہر ہونے تک وہاں سب برادری کے لوگ آگئے۔ ان کے درمیان طے تھا کہ کیا کرنا ہے۔ وہ سیدھے دربار چلے گئے۔ اس دوران بستی کے لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا۔ ان میں بہت سارے لوگ تماشائی کے طور پر ساتھ ہو لئے۔ دربار پر جنید اور بابا سائیں موجود تھے۔

”بابا سائیں۔! آپ ضمانتی ہو، پیروزاں کو یا اس صحافی لڑکی کے وٹے کے بارے میں بتانا تھا۔ پھر یہ لوگ پہلے ہی کیوں ادھر آگئے ہیں۔“

”سن لو خدا بخش۔! وہ لوگ یہی بتانے آئے ہیں کہ انہیں یہ وٹے سٹے کی شرط منظور نہیں ہے۔“ بابا سائیں کسی خوف کے بغیر کہا

”اس کا مطلب ہے انہوں نے پنچائیت کا فیصلہ نہیں مانا؟“

”پنچائیت کے فیصلے کے مطابق ہی انہوں نے جواب دیا ہے۔ اب آگے تمہاری مرضی، تم جو چاہو سو کرو۔ مہر و کارشتہ نہ دو۔ وہ نہیں مانگتے۔“

رشتے دار بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر خدا بخش کی آنکھوں سے شعلے ابل رہے تھے۔ اس نے سب کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے باپ سے کہا

”بابا! میں جانتی ہوں کہ اب آپ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں، تو کیوں اس وسارے کی زندگی جیل میں برباد کرتے ہیں۔ میں خود مر جاتی ہوں۔ لیکن جنید اور پھوپھی کو کچھ نہ کہیں، انہیں جانے دیں۔“

”دفعہ ہو جا یہاں سے۔ یہ سارے تیرے ہی کانٹے ہیں جو ہم چن رہے ہیں۔ وہ یہاں تیرے لئے ہی تو ہیں ادھر، اب نہ وہ رہیں گے اور نہ تم۔“

”بابا! میری منت مان لیں، ایک بار انہیں میرے کہنے پر معاف کر دیں۔ کہیں تو میں خود انہیں سمجھا دیتی ہوں۔“

”یہی تو تم چاہتی ہو، ان کے پاس چلی جاؤ.... اور ان کے ساتھ فرار ہو جاؤ۔ ابھی کرتے ہیں تیرا بندوبست، جا اب دفعہ ہو جا۔“ خدا بخش نے نفرت سے کہا تو مہرونے انتہائی دکھ بھری نگاہوں سے دیکھا اور واپس اندر کمرے کی طرف پلٹ گئی۔ وہ اب مایوس ہو چکی تھی۔ اسے اپنا مرنا تو قبول تھا لیکن اس کا دل نہیں مان رہا جنید اور پھوپھی پیر و زواں کو کچھ ہو جائے۔ وہ کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گئی۔ تبھی اس کی ماں شرماں مائی روتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

”یہاں اور وہاں مرنے میں فرق ہے فروا“ مہرونے دھیمے لہجے میں کہا

”ہاں مانتی ہوں بہت فرق ہے۔ تو اپنے باپ کے ہاتھوں مر رہی ہے تو مر جا، پھر جنید پر کوئی الزام نہیں ہوگا، وہ تو اب بھی وہاں تیرا انتظار کر رہا ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی کافی سارے لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ ان میں وسایانا می وہی جوان بھی تھا جس کے ذمے برادری نے اس سے شادی کرنا اور ان دونوں کے قتل کی ذمہ داری دی تھی۔ وہ آتے ہی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور سرد سے لہجے میں بولا

”یہ مہرو اس طرح زمین پر کیوں بیٹھی ہے۔ ادھر لاؤ میرے پاس، اس سے میرا نکاح ہونے والا ہے۔ ابھی مولوی آتا ہے۔“

یہ سن کر مہرونے غضب ناک نگاہوں سے اسے دیکھا اور کڑک کر بولی

”وسایا۔! جن پیروں سے چل کر یہاں آیا ہے انہی سے واپس چلا جا۔ میں کل بھی جنید کی دلہن تھی۔ آج بھی اسی کی ہوں۔ میں مر تو سکتی ہوں لیکن کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔“

”یہ تیرا آخری فیصلہ ہے؟“ وہ غراتے ہوئے بولا

”آخری اور ہمیشہ کے لئے۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا تو وسایا غصے میں کھڑا ہو گیا اور بولا

”تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو جا۔“

”میں موت سے نہیں ڈرتی۔“ مہرونے اعتماد سے وسایا نے اپنی شال کے نیچے سے گن نکالی اور اس کی نال مہرو کی طرف سیدھی کر دی۔ تبھی فروا آگے بڑھی اور مہرو کے سامنے ہو گئی۔

”اسے مارنے سے پہلے مجھے مار سکتے ہو تو مارو۔“

”اے لڑکی۔ پاگل مت بن، ہٹ جا سامنے سے، تین کی جگہ چار کی گنتی بھی ہو سکتی ہے۔“

”لیکن یہ بہت بھاری ہو سکتی ہے۔“

وساے کے جواب دینے سے پہلے ہی مہرو آگے بڑھی اور زور سے یوں بولی جیسے پاگل ہو گئی ہو۔

”دیکھ وسایا! میں نے صرف اپنے باپ کے ہاتھوں مرنا ہے، تو نے اگر گولی چلائی تو تیرا کوئی زندہ نہیں رہے گا۔ جابلو میرے باپ کو مجھے مارے۔“

”وہ نہیں آئے گا۔“ اس نے یہ کہا اور گن کو بولٹ مارنا ہی چاہتا تھا کہ فروا کے ساتھ آئے ایک بندے نے اس کے سر پر گن کا بٹ مارا، اس کا ذرا سادھیان بٹا تو گن اس سے چھین لی گئی۔ تبھی مہرونے کہا

”تو پھر اس کے ساتھ میں بھی مروں گا۔ میں جا رہا ہوں اس کے پاس۔ کیا لڑکی اولاد نہیں ہوتی۔ کیا وہ انسان نہیں ہے۔ اولاد چاہئے تو تو مہر و کو جنید کے نکاح میں دینے کے لئے جنڈ تلے آجائیں۔“ فرید نے کہا اور کار کی جانب چلا گیا۔ اس نے گھر سے کار نکالی اور جنڈ کے درخت کے پاس چلا گیا۔ وہ لوگوں کا جھگڑا لگا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس کی کار وہاں رکی، لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پیروزاں، فروا اور جنید وہیں تھے۔

اس وقت فرید اپنی بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگائے ہوئے تھا۔ جب خدا بخش وہیں آ گیا۔ اس کے ساتھ بستی کے چند لوگ تھے۔ اس نے آتے ہی مہر و کے سر پر ہاتھ رکھا اور روتے ہوئے کہا

”جیسے تیری مرضی پتر، میں تیری خوشی میں راضی ہوں۔“

اس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ پیروزاں، مہر و، فرید اور جنید اس کے ساتھ لگ گئے۔ ایک دم سے ماحول میں خوشی رچ بس گئی۔

”میں سارے دکھ بھول گئی ہوں بھائی، تیرے اس فیصلے سے۔“ پیروزاں نے کہا

”تو انہیں لے کر دربار پر آجا، ابھی ان کا نکاح ہو گا۔ باقی باتیں پھر کر لیں گے۔“ خدا بخش نے کہا اور دربار کی طرف چل دیا۔ تبھی فرید نے فروا کی طرف دیکھ کر کہا

”آپ فروا ہو؟“

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

www.pakistanipoint.com

”دلہن تولے کر جاؤں گا۔ ابھی چلتے ہیں۔“ جنید نے کہا اور اپنی دلہن کو دیکھا جو سر جھکائے اپنے باپ کے گلے لگ کر روئے چلی جا رہی تھی۔ خدا بخش نے اسے خود سے جدا کیا اور دولہا کی گاڑی میں بٹھا دیا۔



